

## دین و فلسفہ - ابن رشد کی نظر میں

ڈاکٹر سید ناصر زیدی ☆

غالباً منطقی اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ایک منظم اور مربوط فلسفے کا آغاز سقراط اور پھر اس کے شاگرد افلاطون اور ارسطو کے افکار و نظریات سے ہوا۔ ان کے فلسفے نے ان مسائل کو بھی موضوع گفتگو بنایا جن کا تعلق دین کے قلمرو سے تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ تاریخ میں بعض حکماء اور قدیم علماء کی طرف سے سقراط کو ہی نہیں بلکہ افلاطون اور ارسطو کو بھی نبی قرار دیا گیا<sup>(۱)</sup> خود سقراط کی شخصیت اور افکار میں دینی عناصر کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ سقراط کا یہ کہنا کہ میں اپنے اندر ضمیر کی آواز کو محسوس کرتا ہوں کہ جسے میں خدا کی آواز سمجھتا ہوں، اسی طرح موت کے سامنے سقراط کا اطمینان اور اظہار شجاعت اور دنیا سے بے اعتنائی<sup>(۲)</sup> کو اس کی دینی شخصیت کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر جب دینی اصولوں کو ارسطو کے فلسفے کا باقاعدہ سامنا کرنا پڑا تو بھی کوئی بڑی مشکل پیش نہیں آئی حتیٰ کہ بہت سے محققین کی نظر میں دونوں کے درمیان ہم فکری و ہم آہنگی اور باہمی تعاون کا سلسلہ جاری رہا۔ فلسفہ دین کی بنیادوں کو مضبوط کرتا رہا اور دین فلسفہ کو نئے افق سے روشناس کراتا رہا۔ مثلاً ارسطو نے توحیدی ادیان سے کئی برس قبل ہی خدا کے وجود کو ”غیر متحرک محرک“ کے عنوان سے متعارف کرایا اور اسی چیز نے ادیانِ الٰہی کو آگے بڑھنے میں بہت زیادہ مدد دی جبکہ اس کے مقابلے میں دین نے ”خلق“ (کائنات کے حادث اور قدیم ہونے) کی بحث چھیڑ کر فلاسفہ کو ایک نئے مسئلے پر سوچنے کے لئے مجبور کیا۔ تاہم یہ سلسلہ اسی طرح جاری نہ رہا اور بعد کے ادوار میں تاریخ انسانیت نے دین و فلسفے یا عقل و وحی کے درمیان فلاسفہ، مشکلمین اور فقہاء کے درمیان زبردست معرکہ آرائی دیکھی جو آج تک جاری ہے۔ البتہ اس معرکہ آرائی کی مغربی اور اسلامی دنیا میں الگ الگ تاریخ ہے۔

مغرب میں عقل و وحی کا مسئلہ

ایشیہن جلسن (Etienne Gilson) (۱۸۸۴-۱۹۷۹ء) نے عقل و وحی کے درمیان باہمی رابطے

قرار دیتے ہیں چاہے وہ سائنسی علوم ہوں یا مابعد الطبعی علوم۔<sup>(۳)</sup> ان حکماء کی نظر میں فلاح و نجات کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ کتاب مقدس میں بیان کر دی گئیں ہیں لہذا صرف شریعت کو سیکھ لینا ہی کافی ہے۔ اس کے علاوہ مزید کسی بھی علم کی ضرورت نہیں ہے جس میں فلسفہ بھی شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ براہ راست انسان سے ہم کلام ہوا ہے جس کے بعد غور و فکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ بہر حال ان فلاسفہ کے خیال میں وحی اور عقل کے درمیان منطقی تعارض موجود ہے<sup>(۴)</sup> جبکہ تھامس اگستین (Saint Augustin) (345-430) جیسے فلاسفہ کا خیال ہے حقیقت تک پہنچنے کا راستہ کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو عقل سے شروع ہوتا ہو اور ایمان پر عقلی یقین کے ساتھ ختم ہوتا ہو بلکہ اس کے برخلاف ایسا راستہ ہے جس کا مبداء، ایمان ہے اور وحی سے عقل کی طرف جاتا ہے۔ اگستین کا کہنا ہے ”فہم، ایمان کا نتیجہ ہے لہذا اس کوشش میں نہ رہو کہ پہلے سمجھو پھر ایمان لاؤ بلکہ پہلے ایمان لاؤ تاکہ سمجھ سکو“<sup>(۵)</sup> قرون وسطی کے ایک اور فلسفی آنسلم (Anselm) (1033-1109) کا کہنا ہے: میں اس کوشش میں نہیں ہوں کہ پہلے سمجھوں پھر ایمان لاؤں بلکہ ایمان اس لئے لاتا ہوں کہ سمجھ سکوں۔ اسی طرح میں اس لئے بھی ایمان لاتا ہوں کہ جب تک ایمان نہیں لاؤں گا کچھ نہیں سمجھوں گا“۔ جلسن پیروان ابن رشد کے نام سے فلاسفہ کے ایک اور طبقے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان فلاسفہ کے نزدیک عقل و وحی کے درمیان کسی قسم کا تعارض نہیں پایا جاتا اور انسان کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ وہ عقل خداداد کو استعمال کرے۔ جلسن کا کہنا ہے کہ قرون وسطی کے مفکرین دو قسم کی عقل کے قائل تھے ایک جزئی اور ریاضیاتی عقل (Partial Intellect) اور دوسری عقل کلی (Whole Intellect)، لیکن عصر جدید میں صرف عقل جزئی کو اہمیت حاصل ہے۔ اسی لئے گلیلو (Galileo) (1564-1642)، نیوٹن (Newton) (1643-1727) اور ڈکارٹ (Descartes) (1596-1650) کی طرف سے دنیا کو ریاضیاتی شکل میں دیکھنے کا رجحان غالب آگیا۔<sup>(۶)</sup> ایمان باربر کا کہنا ہے کہ عقل جزئی اس مقام تک پہنچ گئی ہے کہ اب اللہ اور اس کی طرف سے بھیجی گئی وحی کی کوئی حیثیت نہیں رہی بلکہ عقل خود کو مستقل سمجھنے لگی ہے۔ یہاں تک یورپ کے صنعتی انقلاب کے دور میں عقل کو مطلقہ حاکمیت حاصل ہو گئی تھی کہ آسمانی دین سے نفرت کو رواج حاصل ہوا اور الہی و آسمانی دین کی جگہ طبعی دین (Natural Religion) نے لے لی۔<sup>(۷)</sup>

(ج) وہ مفکرین جو طبعی اور الہی دونوں ادیان کی مختلف صورتوں کا انکار کرتے ہوئے حیات انسانی کے تمام شعبوں میں صرف عقل کی قوت و توانائی کو مانتے تھے۔ پھر اس کے خلاف بھی کلیسا کی طرف سے رد عمل سامنے آیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ رومانٹک (Romantic) اور فلسفیانہ تحریک کا بھی آغاز ہوا۔ اٹھارویں صدی کے برطانوی فلسفی ڈیوڈ ہیوم (David Hume) (1711-1776) نے قانون علت و معلول (Cause and Effect) کو مسترد کر کے عیسائیت کی عقلی حیثیت کو چیلنج کر دیا اور پھر نامور جرمن فلسفی کانٹ (Kant) (1724-1804) نے ادراک حقیقت کے سلسلے میں اپنی کتاب تنقید عقل محض (Critique of Pure Reason) میں یہ نظریہ پیش کرتے ہوئے کہ کائنات کی اشیاء کی فی نفسہ معرفت حاصل نہیں کی جا سکتی، عقل کی محدودیت کی بات کی اور اثبات خدا سمیت تمام مابعد الطبعی مسائل کو عقل نظری کی قوت و توانائی کی حدود سے خارج کر دیا<sup>(۸)</sup> اور یوں اپنے اس نظریے کے ساتھ بعد میں آنے والے کیرکاگارد (Kierkegaard) (1768-1855)، ہیگل (Hegel) (1770-1831)، ہسرل (Husserl) (1895-1938) جیسے فلاسفہ اور مظہریت (Phinomenology)، وجودیت (Existentialism) اور اثباتیت (Positivism) جیسے فلسفیانہ مکاتب کو شدید متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب مغرب کی فلسفی دنیا میں اکثریت کے نزدیک دینی اعتقادات منطقی لحاظ سے قابل اثبات نہیں سمجھے جاتے اور تجربہ دینی (Religious Experience) کی بنیاد پر وحی و ایمان کی توجیہ کی تحریک اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ کانٹ کے بعد سامنے آنے والی فلسفیانہ تحریکوں میں فلسفہ اثباتیت (Positivism) نے دین کی عقلی حیثیت پر ایک اہم ضرب لگائی۔ فلسفہ اثباتیت کا مدعا یہ ہے کہ کسی بھی قضیے کی حقانیت جاننے کے لئے عالمگیر قوانین کی ضرورت ہے۔ یوں اس مکتب نے اپنے فلسفے کی بنیاد محض تجربے پر رکھتے ہوئے، تجربے سے ماوراء ہر چیز کا انکار کر دیا اور پھر اس فلسفے نے دین کے قلمرو میں بھی داخل ہونا شروع کر دیا اور دین کو عقل کی حدود سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔

### عالم اسلام میں عقل و وحی کا تاریخی پس منظر

عالم اسلام میں فلسفہ و دین یا عقل و وحی کا مسئلہ اسی وقت سے باقاعدہ اٹھا جب یونانی فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہونا شروع ہوا۔ صدر اسلام میں خود پیغمبر اسلام ﷺ کی موجودگی اور آپ پر

پڑا تو پھر عقل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا کیونکہ اسلامی خطے میں غیر مسلم بھی آباد تھے مثلاً عراق میں زرتشت اور شام میں یہود و نصاریٰ۔ ان حالات میں مسلمانوں کو ایک مشترکہ زبان یعنی عقل کی ضرورت پڑی۔ عالم اسلام میں مکتب اعتزال (معتزلہ) کی تشکیل اسی ضرورت کے تحت عمل میں آئی جس کا مقصد دین کا عقلی لحاظ سے دفاع کرنا تھا۔

اہل سنت میں سے اہل حدیث اور مکتب تشیع میں سے اخباری مسلک نے دین میں عقل اور عقلی استدلال کے استعمال کی مخالفت کی حتیٰ کہ لوگوں کو علم کلام، منطق اور فلسفہ پڑھنے سے روکنا شروع کر دیا۔ ابن تیمیہ (۱۶۶۱-۷۲۸ھ) نے عقل سے دوری کو حق سے نزدیک ہونے کا معیار اور عقل و شریعت کے درمیان تعارض کے دوران شریعت کو عقل پر مقدم کرنے کو ضروری قرار دیا۔ اسی طرح مسلمان متکلمین نے عدل الہی اور افعال کے ذاتی حسن و قبح کا مسئلہ اٹھایا۔ معتزلی اور شیعہ متکلمین نے حسن و قبح کی ذاتی اور عقلی حیثیت پر زور دیا جبکہ اشاعرہ نے اس کا انکار کیا۔ دوسری صدی ہجری میں شیعوں کے درمیان باطنی تحریک کا آغاز ہوا اور اسماعیلی مکتب وجود میں آیا۔ اس مکتب کے پیروکاروں نے قرآن و سنت کے ظواہر کے باطنی معانی پر زور دیا۔<sup>(۹)</sup>

عقل و دین کا مسئلہ صرف متکلمین کے درمیان ہی نہیں تھا بلکہ مسلمان حکماء اور فلاسفہ کو بھی اس مسئلہ کا سامنا تھا۔ بظاہر ابواسحاق کندی (۱۸۵-۲۶۱ق) عالم اسلام کے وہ پہلے فلسفی تھے جنہوں نے دین و فلسفہ یا عقل و وحی کے اتصال کا نظریہ اپنایا اور اس سلسلے میں اپنے دلائل پیش کیے<sup>(۱۰)</sup> کندی کا کہنا تھا کہ اگر فلسفہ حقائق اشیاء کا علم ہے تو پھر فلسفہ کا انکار حقیقت کا انکار ہے جو بالآخر کفر کا باعث بن جاتا ہے لہذا دین اور فلسفہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور اگر کہیں دین اور فلسفہ کے درمیان تعارض نظر آتا ہے تو دین کی تاویل کی جائے گی۔ نبی اور فلسفی کے درمیان فرق کے سلسلے میں کندی کا کہنا ہے کہ فلسفی ایک دشوار اور پیچیدہ بحث کے بعد حقیقت تک پہنچتا ہے جبکہ نبی نور الہی کے توسط سے بغیر کسی کوشش و جدوجہد کے حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کیونکہ خدا نبی کے نفس کو پاک و طاہر بنا دیتا ہے اور جوں ہی اس کا نفس تطہیر کی منزل سے گزرتا ہے تو وہ غیب کو جاننے لگتا ہے اور وحی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ کندی کا کہنا ہے کہ جس حقیقت کا ادراک کیا جاتا ہے اس میں نبی اور فلسفی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ حضرت محمد ﷺ نے جس چیز کی بھی تعلیم دی ہے وہ عقلی

دین و فلسفہ کے اتصال کے سخت مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دین اور یونانی فلسفہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے<sup>(۱۲)</sup> ابو نصر فارابی (۲۵۹-۳۳۹ھ) دین و فلسفہ کی وحدت کے زبردست حامی تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ شریعت اور حکمت کا سرچشمہ ایک ہی ہے کیونکہ شریعت وحی کی طرف اور حکمت طبیعت کی طرف لوتی ہے کہ جو مخلوق خدا ہی ہے۔ دوسرا یہ کہ نبی اور فلسفی کی معرفت کا سرچشمہ خدا ہی کی ذات ہے۔ نبی جبرائیل کے ذریعے سے اور فلسفی عقل فعال سے معرفت حاصل کرتا ہے۔ فارابی نبی اور فلسفی کے درمیان فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نبی حقائق کو واضح و روشن انداز میں اور مختلف طریقوں سے عالم غیب سے حاصل کرتا ہے جبکہ فلسفی استدلال کے ذریعے حقائق کو غیر مادی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ فارابی کی نظر میں شریعت عام لوگوں سے تمثیل اور تشبیہ کی زبان میں گفتگو کرتی ہے جبکہ فلسفہ لوگوں کے ایک خاص طبقہ یعنی اہل عقل و خرد سے ہم کلام ہوتا ہے۔<sup>(۱۳)</sup>

ابن سینا (۳۲۰-۴۲۸ھ) کا تعلق بھی اُن مسلمان فلاسفہ میں سے ہے جنہوں نے عقل و دین کا رشتہ آپس میں جوڑنے کی بہت زیادہ کوشش کی۔ ابن سینا کی طرف سے فارابی کے نظریہ نبوت کو ہی آگے بڑھاتے ہوئے نبوت کی عقلی بنیادوں پر تفسیر کرنا اور فارابی کی طرح ہی نبی و فلسفی کے درمیان فرق کی مشکل حل کرنے کی کوشش کرنا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عقل و شریعت کو ہم آہنگ کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ ابن سینا اپنے مختصر رسالے ”سر القدر“ میں شرعی تکالیف کی عقلی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: نظام عالم کے تمام و کامل ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ کسی ایک قید کو قبول کریں۔ یا شریعت کی قید کو یا عقل کی قید کو۔ ابن سینا کا کہنا ہے کہ جو بھی ان دونوں پابندیوں سے آزاد ہو گا وہ مفاسد میں گرفتار ہو کر تباہ ہو جائے گا اور نظام کائنات بھی درہم برہم ہو جائے گا۔<sup>(۱۴)</sup> اگرچہ ابن سینا کی ظاہری عبارت سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر عقل کا دامن ہاتھ میں تھام لیا جائے تو شریعت کی ضرورت نہیں رہتی لیکن عقل و شریعت کے سلسلے میں ابن سینا کی تمام عبارات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عقل و شریعت کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے حتیٰ اگر کوئی چیز عقل سے ثابت نہ ہو تو شریعت کو مقدم کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی مسئلے کی عقلی حیثیت کو بھی باقی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن سینا معاد جسمانی (قیامت کے دن جسم و بدن کی برگشت) کا اثبات صرف حدیث نبوی ﷺ کے ذریعے ممکن اور معاد روحانی کو عقل و برہان کے ذریعے

تبصرے کے فلاسفہ کے نظریات کو بیان کیا۔ اس کے بعد تہافتہ الفلاسفہ لکھی جس میں انہوں نے ۲۰ مسئلوں میں فلاسفہ کے نظریات کو مسترد کیا اور ان میں سے تین مسئلوں (کائنات کے قدیم ہونے کا نظریہ، جزئیات کے بارے میں علم خدا کا انکار، معاد جسمانی کا انکار) فلاسفہ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ فلاسفہ کے سلسلے میں غزالی کا اصل مدعا یہ ہے کہ فلاسفہ مکر و فریب سے کام لیتے ہیں۔ جب ان کے نظریات پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اپنے دفاع میں کہتے ہیں کہ علم الہی مشکل ترین علم ہے اور اس تک دسترس حاصل کرنے کے لئے ریاضی و منطق کو سمجھنا ضروری ہے۔ غزالی کا اعتراض یہ ہے کہ ریاضی کا الہیات سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی اگرچہ ریاضی قطعی براہین پر استوار ہوتی ہے جن کا انکار ممکن نہیں لیکن لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الہیات بھی قطعی دلائل پر استوار ہے لہذا فلاسفہ کی طرف سے بیان کی جانے والی ہر چیز ریاضی کی طرح مسلم ہوتی ہے جبکہ الہیات کے باب میں بیان ہونے والا مسئلہ یقینی نہیں بلکہ ظنی ہوتا ہے۔ غزالی کا کہنا ہے کہ اسی طرح منطق کا بھی دین سے کوئی سروکار نہیں یعنی منطق نہ دین کی نفی کرتی ہے نہ تائید بلکہ اس کا تعلق قیاسات، دلائل اور براہین کے مقدمات سے ہے جن سے متکلمین اپنے دلائل کے بیان میں مدد لیتے ہیں لہذا اس دھوکے میں نہیں آنا چاہیے کہ فلاسفہ جو بھی کہتے ہیں ان کے منطقی براہین کے ذریعے تائید ہوتی ہے۔<sup>(۱۶)</sup> یہاں پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غزالی نہ تو عقل کے دشمن ہیں اور نہ ہی فلسفہ کے مخالف بلکہ ان کا کہنا ہے کہ فلسفہ سے منطق اور ریاضی والی توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔

ابن رشد (۵۲۰-۵۹۵ق) نے فلاسفہ پر غزالی کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فلاسفہ کا بھرپور دفاع کیا اور تہافتہ الفلاسفہ کے جواب میں تہافتہ التہافتہ لکھی اور ابن رشد ہی عالم اسلام کے وہ پہلے فلسفی ہیں جنہوں نے دین و فلسفہ کے اتصال کے موضوع پر باقاعدہ قلم اٹھایا اور فصل المقال و تقریر مابین الحکمہ و الشریعہ من الاتصال کے نام سے ایک الگ کتاب لکھی۔ البتہ مغرب میں ابن رشد سے پہلے جن مسلمان فلاسفہ نے دین و فلسفہ کے درمیان ہم آہنگی کی بات کی ہے ان میں ابن باجہ (۵۳۳ھ) اور ابن طفیل (م ۵۸۱ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ابن باجہ نے اپنی کتاب تدبیر الموحد اور ابن طفیل نے حی بن یقظان میں کہا ہے کہ فلسفی نور عقل کے ذریعے تمام اسلامی معارف کا ادراک حاصل کر سکتا ہے اور عقل جس چیز کا ادراک حاصل کرتی ہے وہ شریعت سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔

البتہ صرف خاص لوگ ہی (عقل کے ذریعے) ان معارف تک پہنچ سکتے ہیں عام لوگ نہیں۔<sup>(۱۷)</sup>

سختی کی وجہ سے پراونیس اور سسلی میں منتقل ہو گئے تھے اور غالباً زیادہ تر انہی کی بدولت ان کی تعلیم لاطینی عالم عیسوی میں رائج ہوئی (۱۸) احمد فواد الاھوانی کے نزدیک یورپ میں ابن رشد کی مقبولیت اس امر سے ظاہر ہے لاطینی زبان میں ان کے آثار کے ترجمے ہوئے اور ان کو محفوظ کر لیا گیا ورنہ ابن رشد کے اصل متون کو یا تو جلا دیا گیا ہے یا مخاصمانہ رویہ کی وجہ سے ممنوع قرار دے دیا گیا، نیز یورپ اپنے نشاۃ ثانیہ کے دور میں ابن رشد کے سائنٹیفک منہج کو اختیار کرنے کی طرف زیادہ مائل تھا جبکہ اس وقت مشرق میں سائنس اور فلسفہ، متصوفانہ اور مذہبی تحریکوں کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔ خود ابن رشد بھی سائنس اور مذہب کے درمیان کشمکش سے متاثر ہوئے تھے۔ بالآخر مذہب کو مشرق میں اور سائنس (اور فلسفہ) کو مغرب میں فتح نصیب ہوئی۔ (۱۹)

### عقل و وحی کے مسئلے پر اختلاف کا منشاء

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ چاہے کندی و فارابی ہوں یا ابن سینا و ابن رشد جس کسی نے بھی دین و فلسفہ کے اتصال کا نظریہ اپنایا اس نے ایک خطرناک وادی میں قدم رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے شاید ہی کوئی مخالفین کے اعتراضات سے محفوظ رہا ہو گا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ عقل و وحی کے درمیان اتصال یا افتراق سے متعلق علماء، متکلمین اور فلاسفہ کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مخالفین کی نظر میں دین کی بنیادیں بے چون و چرا تسلیم ہو جانے (تعبد) پر استوار ہیں جبکہ سوال اور جستجو فلسفہ کی روح ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں سوال اور جستجو کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے وہاں فلسفہ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور یہیں سے دین و فلسفہ کے درمیان مطابقت یا عدم مطابقت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ جو علماء دین کو محض سر تسلیم ہونے سے عبارت سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے جو ایمان، عقل کے ذریعے ثابت ہوتا ہے وہ ایمان نہیں ہو سکتا یعنی دین و ایمان کا عقلی اثبات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی عقل و استدلال کائنات کے حقائق جاننے کی کلید ہے۔ ان اشخاص کے نزدیک انسان کی ذات ہمیشہ اس چیز سے بڑھ کر ہوتی ہے جو وہ جانتا ہے اور یہی انسان جس چیز پر دلیل قائم کرتا ہے اس سے زیادہ خود جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلیل و برہان کے ذریعے جس چیز کا علم حاصل ہوتا ہے وہ انسان کی معلومات سے کم ہوتا ہے اور انسان کی معلومات کو خود انسان کی نسبت زیادہ محدود

اگر عقل کا ایک ہی معنی ہوتا تو شاید اس سوال کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن چونکہ مختلف علوم میں عقل کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں لہذا یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عقل و دین کی بحث میں عقل سے کیا مراد ہے۔

فلاسفہ و متکلمین کے نزدیک عقل کا مفہوم

حکماء و متکلمین نے عقل کو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

**عقل جبلی (Instinctive Intellect):** اس سے مراد انسان کے اندر پائی جانے والی وہ قوت ہے جو انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے، نظری علوم کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے اور یہ قوت سب انسانوں میں ایک جیسی نہیں ہوتی۔ (۲۱)

**عقل نظری (Theoretical Intellect):** نفسِ انسانی کی اُن قوائے مدرکہ میں سے ایک قوت کا نام ہے جو کائنات کے اُن حقائق کا ادراک حاصل کرتی ہے جو افعالِ انسانی سے مربوط نہیں ہوتے۔ (۲۲) عقل نظری چار عقلی مراتب یعنی عقل ہیولانی، عقل بالملکہ، عقل بالفعل اور عقل مستفاد سے تشکیل پاتی ہے (۲۳) عقل نظری کا کام استدلال و استنباط، تعریف اور حدود کے تعین، کلیات کے ادراک (چاہے تصورات ہوں یا تصدیقات)، مصادیق پر مفاہیم کے اطلاق، صغریٰ پر کبریٰ کے انطباق اور تقسیم و تجزیے سے عبارت ہے۔ (۲۴)

**عقل عملی (Practical Intellect):** قوائے نفس میں سے ایک قوت جو افعالِ انسانی سے مربوط حقائق کا ادراک حاصل کرتی ہے۔ (۲۵)

**عقل کا کلامی مفہوم (Intellect in Theology):** متکلمین کے نزدیک عقل کا اطلاق مشہورات پر ہوتا ہے جو تمام یا اکثر انسانوں کے درمیان مشترک ہوتے ہیں یعنی وہ قضایا جو واجب القبول ہوں۔ (۲۶)

**عقل برہانی (Logical Reasoning):** اس عقل کا اطلاق اُن یقینی قضایا پر ہوتا ہے جو مقدمات برہان کو تشکیل دیتے ہیں چاہے وہ قضایا بدیہی (Self-Evident Propositions) ہوں یا نظری (Theoretical)۔ (۲۷)



ہے جس کا تعلق برہان سے ہوتا ہے اور وہ یقینی تقاضا پر مشتمل ہوتی ہے۔ پس ایسی صورت میں دینی احکام کے ساتھ منطقی یقین پر مشتمل معلومات کے ممکنہ تعارض پر گفتگو کی جاتی ہے جبکہ وہ مسائل جن کا تعلق انسان کے اختیار اور عملی پہلو سے ہے جیسے عدل، ظلم، تواضع، تکبر، قناعت، حرص وغیرہ تو ان کے صحیح یا غلط ہونے کا تعین عقل عملی کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں عملی مسائل کی صحت و فساد کا تعین یقینی تقویٰ و فطرت اور یقینی فسق و فجور سے ہو گا۔ (۲۸)

عقل و دین۔ چار ممکنہ صورتیں

عقل و دین کے حوالے سے چار ممکنہ صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(الف) وحی کے نزول کا مقصد انسان کو عقل سے بے نیاز کرنا ہے۔ یہاں عقل سے مراد حصول معرفت کے عام طریقے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق سائنس، اخلاق، طب اور دیگر علوم میں جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے اسے کتاب مقدس میں بیان کیا جا چکا ہے لہذا ہر چیز کے لئے کتاب مقدس کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ اس قول کو مغرب میں معروف عیسائی مفکر ٹریلیین (Tertullian) سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہی رجحان بعض مسلمانوں میں قرآن کے سلسلے میں بھی پایا جاتا ہے یعنی قرآن میں ہر چیز موجود ہے لہذا اگر آسمانی کتاب میں کوئی بات خلاف عقل بھی ہوگی تو اسی کو قبول کرنا ہو گا۔

(ب) وحی کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس کے نفس مضمون پر غور و فکر کریں۔ اس نظریے کے قائلین کی رائے میں وحی کے بغیر حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلسل وحی کے محتویات پر غور و فکر کرتا رہے۔ دوسرے الفاظ میں وحی کا پیغام واضح انداز میں ہم تک نہیں پہنچا۔ اسی لئے وحی کو سمجھنے کے لئے عقل کے استعمال کی ضرورت ہے۔ مغرب میں یہ نظریہ ”اگستین“ (Saint Augustin) سے منسوب ہے۔

(ج) ابن رشد نے مغرب کو پہلی مرتبہ اس نظریے سے متعارف کرایا کہ عقل و وحی کے درمیان تعارض کی صورت میں عقل کو مقدم کیا جائے گا اور وحی کی تاویل کی جائے گی۔

(د) عقل و وحی کا اپنا اپنا مخصوص قلمرو ہے۔ نہ تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ دین کے قلمرو میں داخل ہو اور نہ دین کا تقاضا ہے کہ وہ عقل کی حدود میں داخل ہو۔ اس نظریے کے حامی تھامس اکویناس

(St Thomas Aquinas) کا کہنا ہے کہ عقل اور امور کو جان کرتی ہے جو محسوسات کے ذمہ

بتاتا کہ کیا چیز ہے اور کیا نہیں بلکہ دین کی ذمہ داری حلال و حرام یا اچھے اور برے کو بیان کرنا ہے۔ مثلاً دین کا کام یہ بتانا نہیں ہے کہ بندوق کس طرح بنائی جاتی ہے بلکہ جب بن جاتی ہے تو دین اس کے استعمال کی نوعیت کو بیان کرتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ دین صرف فلاح و سعادت کی طرف رہنمائی کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں دین ہماری نیک عاقبت کے احساس کی تسکین کا باعث بنتا ہے جبکہ عقل ہماری حقیقت طلبی کی خواہش کو پورا کرتی ہے۔ بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ دین ہمیں اہداف و مقاصد سے آگاہ کرتا ہے جبکہ عقل، دین کو مطلوبہ اہداف تک پہنچانے کے لئے مناسب وسائل و ذرائع کی نشاندہی کرتی ہے۔

(ر) دین کی زبان، عرفی زبان ہے۔ دین کا اصل ہدف کمال مطلق کی معرفت کی طرف انسانوں کی رہنمائی کرنا اور مقام بندگی کا حصول ہے۔ اس نظریے کی رو سے قرآن کوئی سائنس یا ریاضی کی زبان نہیں ہے اگر قرآن چاند ستاروں، کائنات اور آسمانوں بات کرتا ہے تو اس کا مقصد اپنے مخاطبین کو اصل ہدف کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اگر اس کے مخاطب پہلے سے ہی اپنے عقل و فہم کے مطابق کسی خارجی امر پر ایمان رکھتے ہیں تو دین کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کے اعتقاد کی اصلاح کرے۔ مثلاً اگر اس زمانے میں عرب سات آسمانوں کے قائل تھے تو قرآن منطق کے قانون جدل کی رو سے اسی عقیدے کو بیان کرتے ہوئے اپنے مطلوبہ نتیجہ (اللہ کی خالقیت کا اثبات) کو ثابت کرتا ہے۔ جب قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: من رب السَّمَوَاتِ السَّبْعِ و رب العرش العظيم۔ سيقولون لله قل افلا تتقون تو اس کا اصل ہدف اپنی ربوبیت اور انسانوں کے تقویٰ کا بیان ہے۔ (۲۹)

## عقل کی حدود کہاں تک ہیں؟

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دین میں عقل کی گنجائش ہے جیسا کہ علماء و دانشوروں کی ایک بڑی تعداد اسی نظریے کی حامل ہے تو پھر یہ اہم سوال اٹھتا ہے کہ عقل کی حدود کہاں تک ہیں؟ کہاں تک عقل کو دینی معاملات میں مداخلت کرنے کی اجازت ہے؟ اور عقل کی محدودیت کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ بظاہر عقل و دین کے سلسلے میں اسی کو پیچیدہ ترین مسئلہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ عقل کی قوت و توانائی کے حوالے سے ابھی تک کوئی بھی ایسا معیار پیش نہیں کیا جاسکا ہے جو عقل کی حدود کا تعین کر سکے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو عقل و دین کے سلسلے میں دو قسم کا اختلاف پایا جاتا

پہنچانے کے لئے آیا ہے؟ جبکہ ایک مسئلہ یہ ہے کہ کیا تمام دینی احکام کو عقل کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے؟ بعض معاصر مسلمان دانشوروں نے اس اہم نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اگر یہ کہا بھی جائے کہ ہر چیز کو عقل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دین کے وہ احکام جو عقل کے ذریعے ثابت نہیں ہو سکتے وہ حقیقت نہ رکھتے ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کوئی دینی اعتقاد، عقل کے ذریعے قابل اثبات نہ ہو لیکن حقیقت میں وہ ایک صحیح عقیدہ ہو۔ (۳۰)

بہر حال مسلمان فلاسفہ نے عقل کی محدودیت کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ بنیادی طور پر غزالی کا بھی فلاسفہ پر اعتراض یہی تھا کہ الہی علوم میں عقل کی حیثیت منطوق اور ریاضی کی مانند نہیں ہے۔ اسی طرح علاء الدین طوسی نے کہ جنہوں نے غزالی کی حمایت میں تہافتہ الفلاسفہ لکھی ہے، بڑی تفصیل کے ساتھ عقل کی محدودیت کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے الہیات سے مربوط امور نہایت مشکل اور پیچیدہ ہیں اور انسانی عقل ان امور کے ادراک میں مستقل نہیں ہو سکتی۔ فلاسفہ نے الہیات میں غور و فکر سے کام لیا اور استدلال کے ذریعے ان امور سے متعلق حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن چونکہ عقل انسانی ان امور کے ادراک کی استعداد نہیں رکھتی لہذا فلاسفہ گمراہی کا شکار ہو گئے اور ایک دوسرے کی مخالفت پر اتر آئے۔ (۳۱) اسی طرح ابن میمون قرطبی (۵۱۵-۵۷۶ق) نے بھی عقل کی محدودیت کے مسئلے پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عالم ہستی میں بعض ایسے امور ہیں جن کے ادراک پر عقل قادر ہے جبکہ بعض ایسے امور ہیں جن تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ ابن میمون کا کہنا ہے کہ بعض امور ایسے ہیں جن کا ایک پہلو تو واضح ہوتا ہے لیکن دوسرا پہلو ہمیشہ مجہول رہتا ہے۔ (۳۲)

بہر حال عقل و وحی کے باب میں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ دین نبوی یا دینی احکام کے اثبات میں عقل کا عمل دخل ہے یا نہیں تو قطعی دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اجمالی طور پر عقل کے اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں امام فخر الدین رازی کا استدلال اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر خالص نقلی دلیل کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عقلی دلیل کا ہونا ضروری ہے اگرچہ نقلی دلیل کا تذکرہ کرتے وقت عقلی دلیل کو بیان نہ کیا جاتا ہو۔ فخر الدین رازی کا کہنا ہے کہ عقلی بنیادوں کا تذکرہ نہ کرنا ان کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ آیات و روایات کے بھرتے ہوئے بنیادوں کا تذکرہ نہ کرنا ان کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

ثابت نہیں کریں گے اُس وقت تک نقلی دلیل سے استدلال نہیں کر سکتے۔ (۳۳)

بنا برائے اجمالی طور پر اس بات کا علم حاصل کرنے کے بعد کہ عقل اور وحی کو آپس میں جدا نہیں کیا جا سکتا یہ بنیادی سوال اٹھتا ہے کہ پھر عقل کی حدود کیا ہیں؟ اور عقل کس حد تک دینی اعتقادات کے اثبات میں موثر ہے؟ اس سلسلے میں تین بنیادی نظریات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

### شدید عقلیت پسندی (Strong Rationalism)

اس نظریے کی رو سے تمام کے تمام دینی عقائد کو عقل کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے اور ایمان کے لئے بھی اسی زیادہ سے زیادہ عقلیت پسندی کے مرتبے پر پہنچنا ضروری ہے۔ البتہ اس مقام پر اثبات سے مراد قطعی یقین (Reasoning) بھی ہو سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ جزی ترین دینی مسئلہ پر بھی منطقی برہان سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور معقولیت (Rationality) بھی ہو سکتی ہے۔ جدید مغربی فلاسفہ منطقی یقین کی بجائے معقولیت پر زور دیتے ہیں یعنی کسی عقیدے کو اس طرح عقلی لحاظ سے بیان کرنا کہ وہ دلیل تمام عقلاً کے نزدیک قابل قبول ہو اور اس میں نفی کی بجائے اثبات کی طرف زیادہ رجحان ہو۔ اسی نظریے کی تائید میں برطانوی فلسفی جان لاک (John Locke) ”معتبر اعتقاد“ کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کی رو سے جان لاک کے بقول عیسائیت اپنے دفاع کے لئے ان معیارات کو پیش کر سکتی ہے بشرطیکہ ان کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے اور ان کا دفاع کیا جا سکے۔ برطانوی ریاضی دان کلیرورڈ (William k. Clifford) نے اس نظریے کی شدید حمایت کی ہے۔ تھامس اکویناس کا بھی کہنا ہے کہ دقیق عقلی تحقیق کے ذریعے عیسائیت کی حقیقت کو مطمئن کر دینے کی حد تک ثابت کیا جا سکتا ہے۔

### ایمان پسندی (Fideism)

اس نظریے کی رو سے دینی اعتقادات عقل کے دائرے میں نہیں آتے بلکہ ایمان کسی بھی قسم کے عقلی استدلال کے بغیر ہی وجود میں آتا ہے۔ مغربی فلاسفہ میں کرکیگاڈ (Kierkegaard) (۱۸۱۳-۱۸۵۵) اس نظریے کے سخت حامی تھے۔ ان کا کہنا ہے دینی عقائد نہ صرف عقل کے ذریعے قابل اثبات نہیں ہیں بلکہ بعض تو عقل مخالف بھی ہیں۔ (۳۴)

موجود ہیں:

(الف) اس قسم کے الہیاتی نظام میں دینی احکام اپنی مجموعی اور کلی حیثیت میں دوسرے ادیان یا مکاتب کی نسبت زیادہ قابل دفاع ہیں۔ اس قسم کی عقلیت پسندی میں دینی احکام کو الگ الگ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

(ب) یہ نظریہ نہ تو شدید عقلیت پسندی کو قبول کرتا ہے اور نہ ایمان پسندی کو بلکہ اس نظریے کی رو سے دینی عقائد کا عقلی لحاظ سے تنقیدی جائزہ ممکن ہے لیکن عقل کے ذریعے سے پورے دینی نظام کو قطعی طور پر ثابت بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نظریہ دینی عقائد کے اثبات پر زور دینے کی بجائے اس کی تنقید پر زور دیتا ہے۔ اس نظریے میں اس بات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دینی اعتقادات کو پرکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عقلی صلاحیت کو استعمال کرنا چاہیے جس کا مطلب یہ ہے کہ دینی نظام کی تائید میں بہترین براہین کو جمع کیا جائے پھر ان براہین کا ان دلائل سے موازنہ کیا جائے جو مخالف اعتقادی نظام کے حق میں دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح دینی اعتقادات پر جو اہم اعتراضات کئے گئے ہیں ان کو اہمیت کی نظر سے دیکھیں۔ تنقیدی عقلیت پسندی ان تمام نکات کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی متقاضی بھی ہے کہ اپنی تحقیقات پر قطعیت کے ساتھ اعتماد نہ کیا جائے اور زیادہ خوش فہمی کا شکار نہ ہوں۔ (۳۵)

## دین و فلسفہ - ابن رشد کا موقف

ابن رشد کی اہم ترین علمی خدمات میں سے ایک دین اور فلسفہ یا عقل و وحی کو ہم آہنگ کرنے سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں ابن رشد نے جن اہم مسائل کو موضوع گفتگو بنایا ہے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

ابن رشد اپنی کتاب مناہج الادلة فی عقائد الملة میں لکھتے ہیں: اس کتاب میں میرا مقصد یہی ہے کہ ان ظاہری عقائد پر تحقیق کروں جن کی پابندی کو شریعت نے عام لوگوں پر لازم قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں میرا مطمح نظر اپنی قوت و توانائی کے مطابق مقاصد شریعت کو معلوم کرنا ہے کیونکہ شریعت کے سلسلے میں لوگ سخت تذبذب کا شکار ہیں یہاں تک کہ مختلف فرقے وجود میں آچکے ہیں جن میں گونا گونے سے عقائد شامل ہیں۔ ان کے بعض عقائد عقلی اور فلسفی اصول شریعت کے مالک ہیں اور اللہ ج

اصل وجہ بھی مقاصد شریعت کو صحیح طور سے نہ سمجھنا ہے۔ (۳۶)

ابن رشد کا کہنا ہے کہ فلسفہ خاص لوگوں کے لئے ہے جبکہ شریعت عام لوگوں کے لئے۔ دین یا شریعت کا اصل مقصد عام لوگوں کو سعادت سے ہمکنار کرنا ہے جبکہ فلسفہ کا مقصد بعض لوگوں کو سعادت سے ہمکنار کرنا۔ (۳۷) ابن رشد نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو اعتقادی مسائل کے ساتھ گڈ ٹڈ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے دین و فلسفہ دونوں کو نقصان پہنچے گا اور ارسطو کا مکتب بھی تباہ ہو جائے گا۔ (۳۸) ابن رشد اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فلسفہ کا تعلق صرف عقل اور عقلی اصولوں سے ہے جبکہ دین عقل و وحی دونوں پر استوار ہے۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ انسانی عقل کی حدود معین ہیں اور وہ ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی لہذا شریعت عقلی ادراک کو پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ یعنی عقل جس چیز کے ادراک سے قاصر ہے اللہ نے وہی چیز اسے بخشی ہے۔ (۳۹) ابن رشد کے نزدیک دین محض عقلی اصولوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ وحی کی بنیاد پر آنے والی شریعت میں عقلی اصول بھی شامل ہیں۔ اگر کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ دین کو صرف عقلی اصولوں پر استوار ہونا چاہیے تو اُسے یہ قبول کرنا ہو گا کہ ایسا دین اُس دین کی نسبت جو عقل و وحی دونوں پر استوار ہے، زیادہ ناقص ہو گا۔ (۴۰)

ابن رشد اپنی کتاب فصل المقال و تقریر ما بین الشریعة و الحکمة من الاتصال میں دین اور فلسفہ کے موضوع پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ اس کتاب میں وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا فلسفہ اور علم منطق کی تعلیم شریعت کی نگاہ میں مباح ہے، ممنوع ہے یا شریعت نے اس کی ترغیب دلائی ہے؟ فلسفہ دراصل خالق پر دلالت کرنے کے اعتبار سے مخلوقات پر غور و فکر کرنے کا ہی نام ہے لہذا مخلوقات کی معرفت جتنی زیادہ کامل اور گہری ہوگی، خالق سے آگاہی بھی اتنی ہی زیادہ گہری اور کامل ہوگی۔ دوسری طرف شریعت بھی موجودات پر غور و فکر کرنے اور عقل کے ذریعے ان موجودات کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ قرآن میں بہت سی ایسی آیات موجود ہیں جو قیاس عقلی (logical syllogism) یا عقلی و شرعی دونوں قسم کے قیاس کے استعمال کو واجب گردانتی ہیں۔ پس جب شریعت عقل کے ذریعے غور و فکر کو واجب قرار دیتی ہے اور غور و فکر قیاس یا استدلال کے ذریعے معلوم سے مبہول تک پہنچنے ہی کا نام ہے تو غور و فکر کے عمل کو عقلی قیاس پر

دلیل و برہان یا منطقی قیاس راجح تھا؟ اگر نہیں تو پھر اب ایسا کرنا ایک نئی بدعت ہوگی۔ اس سوال کے جواب میں ابن رشد کا کہنا ہے کہ فقہی قیاس بھی بعد میں شروع ہوا ہے جب وہ بدعت نہیں ہے تو یہ بھی بدعت نہیں ہو سکتا۔ (۴۱)

ابن رشد کا کہنا ہے کہ اگر کوئی دلیل و برہان کے راستے پر چلتا ہے لیکن اپنی فطرت میں نقص، تربیت کے فقدان، شہوات کے غلبے یا استاد کی رہنمائی سے محرومی کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے تو یہ چیز اس بات کا باعث نہیں بنی چاہیے کہ جو لوگ اس کے لائق ہیں انہیں اس راستے سے روکا جائے کیونکہ دلیل و برہان کے ذریعے حقیقت تک پہنچنا ذاتاً مطلوب ہے جبکہ اس راستے پر گمراہی کی وجہ سے پہنچنے والا نقصان ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے اصل راستے کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ (۴۲)

ابن رشد کا کہنا ہے ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ شریعت الہیہ حق ہے۔ یہ وہی شریعت ہے جس نے ہمیں فلاح و سعادت کی طرف دعوت دی ہے جو اللہ اور اس کی مخلوقات کی معرفت سے عبارت ہے۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لئے ہر مسلمان اپنے فطری اور طبعی میلانات کے مطابق (اس حقیقت) کی تصدیق کرتا ہے۔ ہر انسان کی اپنی ایک طبیعت اور مزاج ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ برہان کے ذریعے، بعض جدل کے ذریعے اور بعض لوگ خطابت کے فن کے ذریعے کسی حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں اور شریعت نے ان تینوں مناہج کی تائید کی ہے۔ سورۃ نحل کی آیت ۱۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے: اُدْعِ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ..... ابن رشد کا کہنا ہے کہ چونکہ شریعت، حق ہے اور ہر ایک کو حقیقت کی شناخت کی خاطر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے لہذا برہان کبھی شریعت سے متصادم نہیں ہو سکتا یا دوسرے الفاظ میں حقیقت کبھی حقیقت کے مخالف نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے موافق ہی ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر ابن رشد اپنے نظریہ تاویل کی وضاحت کرتے ہیں جس کا دین و فلسفہ میں ہم آہنگی سے متعلق اُن کے نظریے کو سمجھنے میں بہت اہم کردار ہے۔ (۴۳)

## ابن رشد کا نظریہ تاویل

ابن رشد کے نزدیک تاویل کے معنی ہیں: حقیقت کی رہنمائی سے مجاز کی رہنمائی کے لئے لفظ کی رہنمائی حاصل کرنا۔ بغیر اس کے کہ کلام میں مجاز کے استعمال سے زمان عرب میں خلل واقع

ہے۔ (۳۴) اُن کا کہنا ہے کہ شریعت کا ایک ظاہری رخ ہوتا ہے اور ایک باطنی۔ عقلی دلیل (برہان) جس چیز کی معرفت کی طرف رہنمائی کرتی ہے، شریعت میں یا تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کہا گیا تو بھی کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق اُن احکام سے ہو گا جن کے بارے میں شریعت نے خاموشی اختیار کی ہے لیکن فقہ شرعی قیاس کے ذریعے ان کا استنباط کرتا ہے۔ پھر اگر شریعت میں بھی اس کے بارے میں کچھ کہا گیا ہو تو یا تو عقلی دلیل، شریعت کے ظاہری حکم کے مطابق ہو گی یا مخالف۔ اگر موافق ہے تو یہی مطلوب بھی ہے لیکن اگر برہان کے مخالف ہو گا تو پھر اس کی تاویل کرنا ہو گی۔ ابن رشد کا کہنا ہے اگر فقہ بہت سے شرعی احکام کے سلسلے میں تاویل اور برہان کا راستہ اختیار کرے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ فقہ کا قیاس، ظنی ہوتا ہے جبکہ فلسفی کا قیاس، یقینی ہوتا ہے۔ پس ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز تک ہم برہان کی مدد سے پہنچے ہیں اور شریعت کا ظاہری حکم جس کے مخالف ہے، اس کی تاویل کرنا ہو گی۔ یوں منقول و معقول کو ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ شریعت میں کوئی بھی ایسا حکم نہیں ہے جس کا ظاہر نتیجہ برہان کے مخالف ہو مگر یہ کہ اگر شریعت کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو ان میں ایسے شواہد کو تلاش کیا جا سکتا ہے کہ جو یقیناً یا تقریباً اپنی تاویل کی گواہی دے سکتے ہیں۔ ابن رشد شریعت کے ظاہر و باطن میں اختلاف کو، فہم کے اعتبار سے انسانوں کے جمعی اختلاف اور ان کی استعداد و صلاحیت میں پائے جانے والے فرق کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ (۳۵)

## ابن رشد کے نظریہ تاویل کے بنیادی اصول

ابن رشد اپنی کتاب منہاج الاذلہ میں تاویل کی شرائط کو یوں بیان کرتے ہیں:

شریعت کے (الفاظ) میں پانچ قسم کے معانی پائے جاتے ہیں جو بجائے خود دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

(الف) وہ معانی جو ناقابل تقسیم ہیں (جیسے نص شرعی کہ جس کی تاویل نہیں کی جا سکتی)

(ب) وہ معانی جو قابل تقسیم ہیں۔ ان کی چار اقسام ہیں:

۱۔ شریعت کی طرف سے جس معنی کی وضاحت کی گئی ہے وہ حقیقی معنی نہ ہو بلکہ اسی کی جگہ تمثیلاً کسی



ہی سمجھا جا سکتا ہے اور صرف ایسے افراد ہی اس قیاس کے ذریعے اصل معانی کو سمجھ سکتے ہیں جو بہت اعلیٰ استعداد کے مالک ہوں اور انہیں کئی فنون میں دسترس حاصل ہو۔ دوسرے الفاظ میں صرف طویل راستہ طے کرنے کے بعد ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ علامتی طور پر جس معنی کو بیان کیا گیا ہے وہ حقیقی معنی نہیں ہے۔

دوم۔ وہ معنی جس میں دو چیزوں کو آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جو چیز بیان کی گئی ہے وہ ایک علامت اور مثال ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کس چیز کی علامت ہے۔

سوم۔ وہ معنی جس کے بارے میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی چیز کی علامت ہے لیکن یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ یہ کس چیز کے لئے علامت ہے۔

چہارم۔ وہ معنی جس کے بارے میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کس کی علامت ہے لیکن یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ یہ کسی چیز کی علامت ہے بھی یا نہیں۔

ابن رشد کا کہنا ہے پہلی قسم کی تاویل نہیں کی جاسکتی اور جہاں تک دوسری قسم (وہ معانی جو قابل تقسیم ہیں) کا تعلق ہے کہ جس کی بجائے خود چار اقسام تھیں تو پہلی قسم (جو بہت پیچیدہ اور مشکل ہے) کی تاویل کا صرف راسخون فی العلم کو حق حاصل ہے اور اسے صرف انہیں کے سامنے بیان کیا جانا چاہیے۔ جہاں تک دوسری قسم کا تعلق ہے جو ہر لحاظ سے آسان ہے تو اس کی تاویل ہی اصل مقصد ہے اور اس کی تاویل کو بیان کرنا واجب ہے۔ تیسری قسم میں (جہاں تمثیل ہونے کا علم ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ کس چیز کے لئے تمثیل بیان کی گئی ہے) صرف اہل علم و دانش کو تاویل کا حق حاصل ہے اور یہ تاویل اسی کے سامنے بیان کی جانی چاہیے جو اس بات کو سمجھتا ہے کہ یہ ایک تمثیل ہے لیکن اُسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تمثیل کس چیز کے لئے ہے۔ چوتھی قسم میں (جہاں یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ایک تمثیل ہے لیکن اگر معلوم ہو جائے تو اس چیز کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کہ یہ کس چیز کے لئے تمثیل ہے) محتاط رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور بہتر یہی ہے کہ شریعت کی حرمت کی خاطر اس کی تاویل نہ کی جائے کیونکہ اگر تیسری اور چوتھی قسم میں تاویل کو ہر خاص و عام کے سامنے بیان کر دیا جائے تو اس سے ایسے عجیب و غریب عقائد پیدا ہو جائیں گے

تعلیم دینا اور صحیح کردار سکھانا ہے۔ منطقی لحاظ سے تعلیم کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ ایک تصور دوسرا تصدیق۔ انسان تین راستوں سے تصدیق کے مرحلے تک پہنچتا ہے۔

(۱) برہان (۲) جدل (۳) خطابت۔

ہر انسان کی طبیعت و سرشت ایسی نہیں ہوتی کہ وہ جدل کو قبول کرے چہ جائیکہ اُن کے لئے برہان قابل قبول ہو۔ کیونکہ جن لوگوں میں برہان کی شرائط کو سمجھنے کی قابلیت موجود ہوتی ہے اُن کو اس کام کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ شریعت کا مقصد ہر ایک کو تعلیم دینا ہے لہذا اُس کے لئے تصدیق کے تمام مناہج اور تصور کی دونوں اقسام (حقیقی اور تمثیلی) کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں ابن رشد کا کہنا ہے شریعت کے سلسلے میں انسان تین قسم کے ہوتے ہیں:

(الف) وہ لوگ جو کسی بھی لحاظ سے تاویل کے قابل نہیں ہیں۔ ایسے افراد کو اہل خطاب کہا جاتا ہے اور لوگوں کی اکثریت کا تعلق اسی طبقے سے ہوتا ہے۔

(ب) وہ لوگ جن میں اپنی فطرت و جبلت یا عادت کی وجہ سے جدلی تاویل کو سمجھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

(ج) وہ لوگ جو یقینی تاویل کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو برہانی ذہنیت و طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تاویل کو اہل جدل کے سامنے بھی بیان نہیں کیا جانا چاہیے چہ جائیکہ عام لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ کیونکہ اسے کہنے والا اور سننے والا دونوں کفر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاویل میں دو چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ایک ظاہر کا ابطال دوسری اُس چیز کا اثبات جس کی تاویل کی جارہی ہے۔ پس اگر اہل ظاہر کے سامنے ظاہر باطل نہ ہو اور جو تاویل کی گئی ہے وہ ثابت نہ ہو تو اگر وہ چیز اصول شریعت میں سے ہوگی تو یہ چیز اُسے کفر تک پہنچا دے گی۔ (۴۷)

ابن رشد اپنی کتاب فصل المقال میں دین و فلسفہ میں ہم آہنگی کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فلسفہ شریعت کا مددگار اور اس کی شیر خوار بہن ہے اور اپنی ذات میں ایک دوسرے کو دوست

## نظریہ ابن رشد کی اہم خصوصیات

اگرچہ ابن رشد کو اسلامی دنیا میں وہ پذیرائی نہیں ملی جو مغربی دنیا میں دی گئی اور عالم اسلام کو عام طور سے اشاعرہ اور خاص کر غزالی اور ابن تیمیہ کی عقل مخالف تحریکوں نے ہی متاثر کیا لیکن فکری و نظری اعتبار سے ابن رشد کی عقلیت پسند تحریک ہمیشہ عالم اسلام کی فکری تشنگی کو پورا کرتی رہے گی۔ خاص طور سے آج کے دور میں کہ جب مغرب میں عقل ہر طرف اپنی طاقت کا لوہا منوا چکی ہے حتیٰ کہ دین کو بھی محض عقلی بنیادوں پر استوار کیا جا رہا ہے اور وحی کی حقانیت اور ضرورت کو چیلنج کیا جا چکا ہے۔ ان حالات میں ابن رشد کے فلسفہ کی روشنی میں عقل کی ایسی تعبیر کی ضرورت ہے جس میں عقل کی قوت و طاقت کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ وحی کی ضرورت و اہمیت بھی اجاگر ہو سکے اور عقل کو اُس کی حدود کی طرف متوجہ بھی کیا جاسکے اور دنیا میں عقلی ترقی سے استفادہ کرتے ہوئے دین کو اس طرح پیش کیا جاسکے جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور صاحبان عقل و خرد کو بھی مطمئن کر سکے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ابن رشد کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی دنیا میں عقل کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے روشن رکھنے کی بنیادیں فراہم کر دی ہیں کیونکہ مسلمان معاشرہ عقلی و فکری لحاظ سے پختگی کے مرحلے تک پہنچے بغیر نہ تو ماڈرن عقل کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی دینی مشکلات کو حل کر سکتا ہے۔

مجموعی طور پر ابن رشد نے جن اہم مسائل کو موضوع گفتگو بنایا ہے اُن میں سے ایک مقاصد شریعت کا مسئلہ ہے۔ ابن رشد کے نزدیک مسلمانوں کے درمیان اختلاف و انتشار اور ایک دوسرے کی تکفیر کی ایک اہم وجہ مقاصد شریعت کو نظر انداز کرنا ہے۔ ابن رشد نے مقاصد شریعت سے عدم واقفیت کو ہی مسلمانوں میں گمراہی کا اصل سبب بھی قرار دیا ہے۔ بلاشبہ عصر حاضر میں مقاصد شریعت کا مسئلہ اجتہاد کی راہ میں حائل بہت سی بنیادی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس وقت دین فہمی کے سلسلے میں ایک اہم مشکل عقل کے استعمال اور اس کی حدود کا تعین ہے۔ کیا کوئی چیز ایسی ہے کہ جو اس سلسلے میں عقل کی رہنمائی کر سکے؟ اگر عقل کو کوئی ایسا معیار نہ دیا جاسکے جس کی بنیاد روہ دین کی حقانیت کو رکھ سکے اور دین کے قلمرو میں اظہار نظر کر سکے تو پھر فقہاء، متکلمین،

شریعت کو عقل کی رہنمائی کا ذریعہ قرار دے کر ایک بڑی مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے کیونکہ عقل، مقاصد شریعت کو معیار بنا کر بہت سی جگہ واضح موقف اختیار کرتے ہوئے، معروضی حالات میں اپنی حجت کے اثبات کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔ بنا برائیں ابن رشد کے نظریے میں مقاصد شریعت جیسے موضوعات سے استفادہ کر کے عصر حاضر میں عملِ اجتہاد کو موثر بنایا جا سکتا ہے۔

ابن رشد نے دلیل و برہان پر حد سے زیادہ زور دے کر مسلمانوں کو نفسیاتی یا خیالی و وہمی یقین کی بجائے انسانوں کو منطقی یقین کے حصول کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا ہے جو بجائے خود وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یوں انہوں نے دین فہمی اور دین داری میں اندھی تقلید اور جذباتی وابستگی جیسے عناصر کے غلبے کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلا شک تقلیدی ذہنیت اور جذباتی وابستگی، حقائق کو تسلیم کرنے کا شعور چھین لیتی ہے جس کی وجہ سے انسان ظاہر سے باطن اور سطحی فکر سے گہرائی کی طرف جانے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے جبکہ جدید اجتہاد کے لئے ضروری ہے کہ ہر قسم کے تعصب کو چھوڑ کر عقلی رخ سے دین کا مطالعہ کیا جائے کیونکہ صرف منطقی استدلال اور برہان ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو شخصیت پرستی کے شر اور کسی کی بات کو بلا دلیل قبول کرنے کی عادت سے نجات دے سکتا ہے۔

اگر ہم اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ آج کے انسانی معاشرے میں، گزشتہ انسانی معاشرے کی نسبت عقلی و فکری لحاظ سے بنیادی تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور آج کا معاشرہ عقلی اعتبار سے آگے بڑھ رہا ہے تو پھر دنیائے جدید کی بے لگام عقل کا مقابلہ کرنے اور آج کے ماڈرن انسان کو قانع کرنے کے لئے یقینی معارف منطقی استدلال کا سہارا لینے کی ضرورت ہے کیونکہ عقل کا مقابلہ صرف اور صرف عقل ہی کر سکتی ہے۔ اگر غزالی اور ابن تیمیہ وغیرہ نے عقل مخالف تحریک چلائی ہے تو ایسا عقل و منطق کے منج کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہے۔

عقل وحی کے سلسلے میں ابن رشد کے نظریے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عقل کے ساتھ ساتھ وحی کو بھی منبع کی حیثیت سے قبول کیا ہے اور ایسی شریعت کی بات کی ہے جو عقل و وحی دونوں پر مشتمل ہو۔ ابن رشد کے نزدیک عقل، شریعت کی تکمیل اور شریعت عقل کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ ابن رشد نے عقل کی حدود کی بات کر کے عقل کے ممکنہ غلط استعمال کی طرف سے بھی

گویا ابن رشد نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عقل، دین کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ معاصر فلسفی آیت اللہ جوادی آملی نے بھی اسی بات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ عقل و دین ایک دوسرے کے مد مقابل نہیں ہیں بلکہ عقل، شریعت کے لئے اور شریعت عقل و فطرت کے لئے چراغ و رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ انسان کبھی عادت، طبیعت، جبلت، روایت اور حاجت کو فطرت سمجھ بیٹھتا ہے جس کی وجہ سے غلطی کا مرتکب ہوتا ہے لہذا شریعت کی صورت میں ایسے چراغ کی ضرورت ہے جو فطرت کو دوسری چیزوں سے تیز دے سکے اور انسان بھی عقل و فطرت کے مطابق عمل کر سکے۔ (۴۹)

عقل و منطق کے مخالفین نے ہمیشہ انحراف و گمراہی کے مسئلے کو حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ عقل کے استعمال سے انسان گمراہی میں پڑ جاتا ہے اور عملاً ایسا ہوا بھی ہے۔ ابن رشد نے اس اہم اعتراض کا بڑی خوبصورتی سے جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہمیں انحراف سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ دلیل و برہان کے ذریعے حقیقت تک پہنچنا بذاتہ مطلوب ہے جبکہ اس راستے پر چلنے سے ہونے والا نقصان ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ابن رشد نے اپنے اس بیان کے ذریعے یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ اصل کو فرع پر قربان نہیں کیا جانا چاہیے۔ مجموعی طور پر بھی ابن رشد کی عبارات سے یہی پیغام ملتا ہے کہ روح دین کو ظاہر دین پر قربان نہیں کرنا چاہیے اور روح دین پر ہی کہ جو عقل کسی طور پر بھی متصادم نہیں ہے، دین کے ظاہری احکام کو پرکھنا چاہیے۔

ابن رشد نے اس اہم نکتے کو بھی اٹھایا ہے کہ دین فہمی میں صرف اس کے صدر اسلام میں عقلی دلیل کا سہارا نہیں لیا جاتا تھا، دلیل و برہان کا استعمال بدعت نہیں ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں ابن رشد نے ایک باریک پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ قیاس شرعی (فقہی قیاس) بھی صدر اسلام میں موجود نہیں تھا جب وہ ظنی ہونے کے باوجود بدعت نہیں ہے تو اس کی یقینی صورت کیونکر بدعت ہو سکتی ہے؟ گویا ابن رشد نے یہاں پر بھی یقینی معارف کے حصول کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ابن رشد نے شریعت کو عوام اور فلسفہ کو خواص کے ساتھ مخصوص کر کے ایک انتہائی حساس اور اختلافی مسئلہ اٹھایا جس پر ابن رشد کو شدید اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ گویا ابن رشد نے ضمنی طور پر

اس کے مثبت رخ کو پیش کرنا فائدے سے خالی نہیں ہو گا۔ اگرچہ ابن رشد کے اس نظریے سے جہاں صاحبان عقل و خرد اور عقلی پختگی کے حامل افراد کو شریعت کے بہت سے ظواہر سے انفرادی طور پر روگردانی کرنے کی ترغیب ملتی ہے وہاں عقل و منطق کے راستے پر چلنے والوں کے لئے روح دین کو سمجھنے اور حقیقتِ دین سے دین کے نام پر غیر دینی یا غیر اصلی عناصر کو جدا کرنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں افراد ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ ایسا طبقہ بھی موجود ہوتا ہے جو ہر چیز کو عقل و منطق پر پرکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دین دار بھی ہوتا ہے۔ پھر کبھی اس کا ذہن دین کے نام پر رائج ہو جانے والی بہت سی روایات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ابن رشد کا یہ موقف کہ شریعت عام لوگوں کے لئے ہے اور فلسفہ خاص لوگوں کے لئے، ایسے افراد کو نفسیاتی سکون عطا کرنے اور اپنے طور پر دین کے ظواہر کی تاویل کرنے کی جرأت عطا کرتا ہے۔

ابن رشد نے فہم حقیقت کے اعتبار سے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو دلیل و برہان کے ذریعے حقیقت کا ادراک کرنے پر قادر ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو جدل کے راستے سے حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں اور تیسرے وہ جو صرف خطابِ راستے سے معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ لوگ اپنی طبیعت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنی طبیعت کے مطابق ہی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ابن رشد نے اپنے اس موقف کی تائید میں قرآنی آیت سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے قرآن ان تینوں راستوں کی تائید کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ادع الی سبیل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة و جادلہم بالنی ہی احسن۔ اس مقام پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر قرآن نے ان تینوں راستوں کی تائید نہ کی ہوتی تو ابن رشد جیسے فلسفی کے لئے بھی جدل اور خطابِ راستے کو صحیح قرار دینا آسان نہ ہوتا۔ بہر حال ابن رشد نے لوگوں کے تینوں طبقات کو اہمیت دے کر نفسیاتی لحاظ سے کسی ایک طبقے کو مایوس نہیں ہونے دیا لیکن اسی کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ تینوں طبقات مختلف مناہج کے ساتھ ایک ہی حقیقت تک پہنچ جائیں اور سب کے راستوں کو درست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ یوں ابن رشد پر دین کے سلسلے میں بیک وقت دو مختلف حقیقتوں کا نظریہ اپنانے کا الزام لگا یا گیا جس کا جائزہ آگے چل کر لیا جائے گا۔

بالآخر ابن رشد نے اپنی تحقیقات کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے یہ نظریہ اپنایا کہ شریعت کبھی بھی عقل

کے درمیان زبردست اختلاف کا آغاز ہوا جو آج تک جاری ہے۔ ابن رشد کے نظریات پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لینے سے پہلے ہم اس سوال کا جائزہ لیں گے کہ عقلی دلیل (برہان) شریعت سے متصادم کیوں نہیں ہو سکتی؟

معاصر فلسفی علامہ طباطبائی کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ نقلی دلیل (شریعت) کی دلالت لفظ کے ظنی ظہور کا نتیجہ ہوتی ہے لہذا قطعی دلیل سے اس کا تعارض ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ظواہر عقل کے حکم کو باطل کرتے ہیں تو گویا وہ اپنی حجیت کو باطل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ظواہر کی حجیت عقل کے ذریعے ہی ثابت ہوتی ہے۔ پس عقل و وحی یا شریعت و فلسفہ کے درمیان کبھی تعارض نہیں ہو سکتا۔ (۵۰)

ابن رشد نے عقل کے ساتھ ساتھ دینی متون کی تاویل کی ضرورت پر بھی بے انتہا زور دیا ہے اور ابن رشد کے نظریہ تاویل نے ہی ان کے فلسفہ دین کو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ اگر کوئی دینی حکم دلیل و برہان سے متصادم ہو گا تو اس کی تاویل کرنا ہو گی۔ عصر حاضر کی دین فہمی میں ان کے نظریہ تاویل کی اہمیت بیان کرنے کے لئے، خود تاویل کے حوالے سے چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

علماء و دانشور، تاویل کی اصطلاح سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ یہ ایک قرآنی اصطلاح بھی ہے اور تفسیر قرآن کے باب میں تو تاویل کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بہت زیادہ پیچیدہ اور بحث انگیز بھی ہے اور علماء کی طرف سے ابھی تک کسی چیز کی تاویل کا صحیح معیار سامنے نہیں آسکا ہے۔

قرآن مجید میں کئی مقام پر تاویل کا لفظ واضح طور پر آیا ہے۔ بعض جگہ پر تاویل کا لفظ کسی چیز کے باطن اور حقیقی معنی پر دلالت کرتا ہے جو بہت سے ظاہر بین اور سطحی نگاہ رکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: سانبك بناویل ما لم تستطع علیہ صبراً، قرآن کی اس آیت میں کہ جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کا قصہ بیان ہوا ہے، تاویل کا لفظ باطن کے معنی میں ہی آیا ہے۔ پس تاویل میں باطنی امور پر توجہ کی جاتی ہے اور ظاہر ہمیشہ باطن کی رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ظاہر کو مثال اور باطن کو مثل بھی کہا گیا ہے (۵۱) بالکل اسی طرح جیسے انسان کے جسم اور نفس کے درمیان یا دنیا اور آخرت کے درمیان رابطہ کیونکہ فلاسفہ اور عرفاء کے

ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر محسوس چیز کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے۔ ظاہر کا ادراک حواس خمسہ کے ذریعے کیا جاتا ہے جبکہ باطن کا ادراک عقل و فکر سے کیا جاتا ہے۔ (۵۱)

بہر حال ابن رشد نے تاویل کے مسئلے پر زور دے کر، تاویل سے متعلق مسائل پر غور و فکر کا راستہ کھول دیا ہے۔ ابن رشد کا نظریہ تاویل اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ دور جدید میں تاویل کا مسئلہ، علم التاویل (Hermeneutics) کی صورت میں ایک فکری و فلسفی مکتب اختیار کر چکا ہے جس میں تاویل اور فہم و ادراک کے لئے باقاعدہ اصول ہی وضع نہیں کئے گئے ہیں بلکہ اس علم کے توسط سے خود فہم انسانی کی ماہیت پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اسی طرح علم التاویل کی وجہ سے مفسر کی اپنی شخصیت، اس کی ذاتی پسند و ناپسند، خالی الذہن ہو کر کسی چیز کے فہم و ادراک کے امکان، مفسر کے ذہن میں پہلے سے موجود مفروضات (چاہے ان کا ذکر ہو یا نہ اور چاہے خود مفسر ان کی طرف متوجہ ہو یا نہ) کی تاثیر کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے اور اب اگر کوئی بھی مفسر قدیم روایتی اصولوں پر چلتے ہوئے اپنی تفسیر و تعبیر میں ان اصولوں کو نظر انداز کرتا ہے تو اُس کو اپنا منہج استدلال واضح کرنا پڑے گا۔ آج کے جدید فلسفہ میں لسانیاتی تحلیل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔

جب کانٹ نے فلسفیانہ مباحث کا رخ معرفت و آگاہی کے مسئلے کی طرف موڑ دیا اور وجود شناسی (Ontology) کی جگہ معرفت شناسی (Epistemology) نے اہمیت اختیار کر لی تو بعض مفکرین کے ذہن میں یہ سوال اٹھا کہ کسی متن (Text) کے مطالعے سے حاصل ہونے والی معرفت کس قسم کی ہوتی ہے؟ اس کے بعد سے خود فہم و ادراک کی ماہیت کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ انیسویں صدی کے اوائل ماہر فلسفہ دین شلایر ماخر (Schleiermacher) (1768-1855) نے علم التاویل کی مباحث سے استفادہ کرتے ہوئے اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ متن کو سمجھنے سے کیا مراد ہے؟ زبان کے سلسلے میں علم التاویل کی فلسفیانہ مباحث سے قبل الفاظ کے معانی کو سمجھنے کے لئے الفاظ اور معانی و بیان سے مربوط ادبی و قواعد سے استفادہ کیا جاتا تھا جن میں کسی حد تک استدلالی رنگ بھی پایا جاتا تھا لیکن دینی متون کو سمجھنے کے لئے کسی اور اصول کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ علم التاویل سے قبل الفاظ کی بحث ایک فلسفیانہ بنیاد پر استوار تھی جو افلاطون اور ارسطو کے



وسیلہ ہیں۔ اس قدیم اور روایتی بنیاد کے ہوتے ہوئے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ہی متن، قارئین کی تعداد کے اعتبار سے متعدد معانی کا حامل ہو سکتا ہے لیکن جب اٹھارویں صدی میں زبان ایک پیچیدہ موضوع میں تبدیل ہوئی اور لسانیاتی فلسفہ کی مختلف شاخیں وجود میں آنا شروع ہوئیں تو ”معنی“ کی ماہیت کے بارے میں سادہ تصورات بھی ختم ہو گئے کیونکہ جدید فلسفیانہ نظریات میں معانی کو خارجی حقائق کے مترادف قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس سلسلے میں دو بنیادی نظریات سامنے آئے:

”الف) اس نظریہ کے تحت معانی، خارجی حقائق یا ان کے درمیان تعلق کا نام نہیں بلکہ خارجی حقائق (شے، عمل، صفت، یا فعالیت وغیرہ) کے بارے میں گفتگو کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ معانی (ذرائع) کسی معینہ زبان (اردو، عربی، انگریزی وغیرہ) کی ترکیب میں پائے جاتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت جو شخص کسی متن کو سمجھنا چاہتا ہو گا وہ یہ دیکھنے کے لئے کہ مؤلف نے مخصوص زبان کی ترکیب میں کون سے ممکنہ معنی کو مد نظر رکھا ہے، اپنے نقطہ نظر کے مطابق ایک مفروضہ قائم کرے گا اور پھر اس مفروضہ کے صحیح ثابت کرنے کے لئے استدلال کرے گا۔ اسی طرح ایک دوسرا شخص اپنے حساب سے ایک مفروضہ قائم کرے گا۔ اسی طرح اگرچہ تمام افراد مؤلف کے مد نظر ایک ہی معنی تک پہنچنا چاہتے ہیں لیکن کسی کے پاس بھی اصل معنی تک پہنچنے کا براہ راست ذریعہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بہر حال جس کے دلائل زیادہ قوی ہوں گے اسی کے معنی کو قبول کیا جائے گا۔

”ب) اس نظریے کی رو سے معنی دراصل وہ پیغام ہے جو کسی لفظ، جملے یا متن سے ایک تاریخی ظہور (Historical Manifest) کے عنوان سے قاری یا سامع کے اپنے تاریخی افق (Historical Horizon) میں (جو بجائے خود کائنات اور اپنے بارے میں اس کے تجربے کا ماہصل ہوتا ہے) میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس نظریے میں حقیقت مؤلف کے مد نظر معنی سے وسیع تر ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک کا تاریخی افق دوسرے سے مختلف ہوتا ہے یعنی ہر شخص کا کائنات اور اپنے بارے میں تجربہ مختلف ہوتا ہے لہذا جب قاری اور متن وجود میں آنے کا تاریخی افق آپس میں ملتا ہے تو اس سے مختلف معانی ظہور میں آتے ہیں۔

اگرچہ دونوں نظریات کہ جن میں زبان کی تاریخی (زمانی و مکانی لحاظ سے) حیثیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لسانیاتی فلسفہ سے مربوط ہیں لیکن انہوں نے تاریخیت کو متن کے فہم و ادراک کا جز بنانے

معانی کی طرف لوٹانے کی روایت موجود تھی لیکن اس میں بھی الفاظ و معانی سے متعلق قدیم نظریے یا ادبی و اصولی قواعد کو ہی مفروضات اور تفسیری مناہج کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا لیکن جملوں یا قضاویوں کے ساتھ باطنی، رمزیہ یا مجازی معانی کے عقلی ارتباط کی طرف توجہ نہیں تھی۔ دوسرے الفاظ میں کوئی بھی عقلی لحاظ سے یہ ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ قرآن یا کتاب مقدس کی فلاں آیت کا حقیقت میں وہی مجازی اور باطنی معنی ہے جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ (۵۲)

بنا بر این کہا جا سکتا ہے کہ ابن رشد کا نظریہ تاویل اگرچہ لسانیاتی فلسفہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا لیکن ایک محقق میں اتنی صلاحیت اور فکر ضرور پیدا کر دیتا ہے کہ وہ جدید لسانیاتی فلسفہ کی اہمیت کو سمجھے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے خود کو عصری چیلنجوں کا جواب دینے کے لئے تیار کر سکے۔

### تنقیدی جائزہ

اگرچہ مجموعی طور پر ابن رشد کی عقلی و دینی تحریک عصری چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جس طرح کوئی بھی نظریہ یا علمی تحریک ہر لحاظ سے کامل و بے عیب نہیں ہو سکتی اور اس میں ہمیشہ اصلاح کی گنجائش رہتی ہے اسی طرح ابن رشد کے نظریہ عقل و وحی کو عصری تقاضوں کی روشنی میں دیکھنے، اس کی قوت و توانائی کا جائزہ لینے اور اس میں ممکنہ اضافات کی ضرورت ہے۔

۱۔ بنیادی طور پر ابن رشد نے (ظاہری تعارض کی صورت میں) قرآن و سنت پر جس عقل کو مقدم کیا ہے وہ منطقی قیاس یا برہان ہے۔ منطقی قیاس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ مادے (Material) اور صورت (Form) کے لحاظ سے درست ہو تو یقین کا فائدہ دیتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں چند باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یقین یا منطقی قیاس کی صحت کا معیار کیا ہے؟ کیا اس سلسلے میں تمام عقلاء کا متفق ہونا ضروری ہے؟ کیا کسی ایک دور میں کسی ایک مسئلے کے منطقی ہونے کی تصدیق تمام صاحبان عقل کی طرف سے ممکن ہے؟ یا یہ کہ صرف استدلال کرنے والے کی عقل حجت ہے؟ اگر صرف اس کی عقل حجت ہے تو پھر دوسروں کے لئے کس طرح سے نافذ العمل ہو سکتی ہے؟ بہر حال اس بات سے قطع نظر کہ عقلی و منطقی ہونے کا معیار کیا ہے، یقین اور اثبات کا ایک دوسرے

ہوں گے جب وہ خود بھی صحیح مقدمات پر استوار ہوں۔ بہر حال اس سلسلے کا ایسے واضح و بدیہی مقدمات پر ختم ہونا ضروری ہے جو اپنی صحت کی خود ہی دلیل ہوں۔ بدیہی قضیے اُن قضیوں کو کہتے ہیں جن کا تصور ہی ان کی تصدیق کے لئے کافی ہو۔ اس مقام پر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر قضیہ جو بدیہی نظر آتا ہے وہ بدیہی ہوتا بھی ہے؟ کیا اس بات کا امکان ہے کہ ایک ہی چیز بعض کے نزدیک واضح و بدیہی ہو جبکہ دوسرے کے نزدیک بدیہی نہ ہو؟ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ صاحبان عقل کے درمیان بدیہیات پر اختلاف رہا ہے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی دور میں ایک چیز بدیہی تھی لیکن بعد میں وہی چیز بدیہی نہیں رہی۔ (۵۳) پس ابن رشد پر ایک اعتراض یہ ہے کہ کیا کسی عقیدے کو عملاً منطقی اعتبار سے ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اگر دین کو مجموعی طور پر منطقی اعتبار سے ثابت بھی کیا جاسکے تو کیا دین کی جزئیات کو بھی عقلاً ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر تعارض کی صورت میں عقل کو کس طرح مقدم کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ ابن رشد کا کہنا ہے کہ اگر عقل کا حکم، قطعی ہو تو اس کو نقل پر مقدم کیا جا سکتا ہے۔ بنا بریں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن رشد کم از کم عقائد کی حد تک شدید عقلیت پسندی کے قائل ہیں جس کو قبول کرنا اتنا آسان نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں اعتقادات کا دین کے عملی یا فقہی احکام سے براہ راست تعلق ہے لہذا جب تک اعتقادات کے مسئلے میں عقل کی حیثیت اور حجیت کا فیصلہ نہیں ہوتا اس وقت تک فقہی مسائل میں موثر اجتہاد کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر فقہی مسئلے (فعل انسانی) کا ایک رخ کلامی (فعل خدا) نوعیت کا ہوتا ہے۔ جب تک عقل کے ذریعے فعل اللہ یا اللہ کی حقیقی منشا کا علم نہیں ہوتا فقہی مسئلے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

اس سلسلے میں منطوق پر ابن تیمیہ اور شیعہ محدث ملا محمد امین استر آبادی کے اعتراضات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابن تیمیہ کا منطوق پر ایک اہم اعتراض یہ تھا کہ اگرچہ منطوقی قیاس کی حجیت پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن اسی کے ساتھ ہی منطوقی قیاس کے ذریعے کسی چیز کا علم بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ اگر قیاس کا مواد واضح اور معین ہو تو اس کا نتیجہ قطعی و یقینی ہی ہوگا کیونکہ جب ہم کو معلوم ہوگا کہ ہر الف، ب ہے اور ہر ب، ج ہے تو ہر الف کا ج ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کے ذریعے سے کائنات میں موجود اشیاء

اُن کا کہنا ہے کہ منطقی قیاس ”صورت“ کے اعتبار سے ذہنِ انسانی کو خطا سے روکتا ہے لیکن ”مادہ“ قیاس“ کے اعتبار سے نہیں کیونکہ علم منطقی میں مواد قیاس کی مختلف اقسام کے ساتھ ہر ایک کی خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں (۵۵) لیکن منطقی میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کوئی بھی مخصوص مادہ کس خصوصیت کے تحت آتا ہے؟ استر آبادی کا کہنا ہے کہ کائنات میں کہیں بھی حق اور باطل اپنی خالص شکل میں موجود نہیں ہیں اور حق و باطل کو جدا کرنے کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث کیا ہے: ولو كان الحق على حدة كل واحد منها قائم بشأنه ما احتاج الناس الى نبي ولا وصي ولكن الله عز وجل خلطهما وجعل تفريقهما الى الانبياء، الأئمة۔ (۵۶) استر آبادی کی نظر میں عقل صورت کے اعتبار سے صحیح و غلط قضیوں کو سمجھ سکتی ہے لیکن قضیوں کے مواد میں حق و باطل کی آمیزش کو سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔ ان کا کہنا ہے صرف علم ریاضی اور منطقی کے بعض ابواب ہی ایسے ہیں جن میں قیاس کا مادہ انسانی حواس سے نزدیک تر ہوتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ حکمائے الہی اور ماہرین طبیعت اسی طرح متکلمین اور فقہاء کے درمیان علمی مسائل میں اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان علوم میں قیاس کا مادہ انسانی حواس سے دور ہوتا ہے۔ (۵۷)

پس ایسی صورت میں کہ جب ہمارے پاس منطقی یقین تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو کیا ہم اس سے نزدیک تر راستے کو حجت قرار دے سکتے ہیں؟ دوسرے الفاظ میں اگر کسی جگہ پر مکمل طور پر منطقی یقین حاصل نہ ہو لیکن عقلی رجحان موجود ہو تو کیا اُس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور عقل و نقل میں تعارض کی صورت میں عقل کو مقدم کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ ابن رشد پر ہونے والے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ وہ دو مختلف حقیقتوں کے قائل تھے۔ (۵۷) بنیادی طور پر یہ اعتراض ابن رشد کے اس نظریے پر کیا گیا ہے جس کے تحت انہوں نے فلاسفہ اور عام لوگوں کے لئے ایک الگ دین کی بات کی ہے یعنی فلاسفہ کا دین عام لوگوں کے دین سے ایک مختلف چیز ہے کیونکہ فلاسفہ مقاصد قرآن کی حقیقت کا ادراک رکھنے کی وجہ سے قرآنی آیات کی تاویل کا حق رکھتے ہیں جبکہ بظاہر ابن رشد کی یہ بات اہل شریعت اور متکلمین کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اُن کے نزدیک دین الہی یعنی اسلام ایک ہی ہے اور اس کے احکام تمام لوگوں کے لئے یکساں طور پر نازل ہوئے ہیں۔ البتہ ابن رشد کے فلسفہ دین میں کافی پیچیدگی کے

جہاں تک ابن رشد پر اس اعتراض کا تعلق ہے کہ وہ دین کے سلسلے میں دو مختلف حقیقتوں کے قائل تھے تو اس کا جواب ملا صدرا (۱۵۷۱-۱۵۷۲ء) کے نظریہ تشکیل وجود<sup>(۵۹)</sup> کی بنیاد پر دیا جا سکتا ہے جس کی رو سے وجود ہستی اپنی حقیقی وحدت کے ساتھ مختلف مراتب کی حامل ہے۔ مثلاً سورج کی روشنی اپنی ماہیت کے اعتبار سے روشنی ہے لیکن شدت و ضعف کے اعتبار سے مختلف۔ اس بنیاد پر ظاہر و باطن کو ایک ہی حقیقت کے دو مرحلے قرار دیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ابن رشد کے نزدیک دین مختلف حقیقتوں کا نام نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے کئی درجات کا نام ہے۔ بعض درجات تک صرف فلاسفہ پہنچ سکتے ہیں اور عوام کی ان تک کوئی رسائی نہیں ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن رشد نے اہل جدل اور اہل خطابہ کی معرفت کو صحیح قرار دے کر اپنے خلاف ممکنہ اعتراضات اور مخالفتوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اگرچہ جدل اور خطابہ راستے میں بھی حقیقت کا کوئی نہ کوئی درجہ ضرور موجود ہوتا ہے لیکن اس میں اور خاص کر خطابہ کے راستے میں انحرافات اور کج فہمی کے امکانات بہت روشن ہوتے ہیں۔

۳۔ دین فہمی اور اجتہاد کے حوالے سے اس وقت بنیادی مسئلہ فقہی احکام کی عصری تقاضوں کے مطابق تشریح و تعبیر ہے اور موجودہ دور میں دین کے اسی پہلو پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض فقہی احکام آج کی جدید انسانی عقل سے ٹکراتے ہیں۔ عام طور سے علماء و حکماء اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ عقل اعتقادی اور اخلاقی مسائل اور فروعات دین میں عملی مسائل کی کلیات (Generalities) کے ادراک پر قادر ہے لیکن جزئیات کا تعلق چونکہ خصوصی مصالح سے ہے لہذا وہ عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بنیادی اور مؤثر اجتہاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جزئی مسائل میں عقل کے استعمال پر پایا جانے والا اختلاف ہے۔ دوسرے الفاظ میں اصل اختلاف یہ ہے کہ کیا عقل جزئی مسائل میں مصالح و مفاسد کا ادراک رکھتی ہے یا اس سلسلے میں صرف شریعت کی مدد ہی لینی پڑے گی؟ عصر حاضر میں عقل کے حوالے سے جن مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے ان میں کسی حکم میں پائی جانے والی علت اور حکمت کے ادراک، واضح شرعی حکم نہ ہونے کی صورت میں مصالح مرسلہ اور مقاصد شریعہ کی روشنی میں حکم شرعی کے استنباط، دین کے ثابت (دامنی) و متغیر (غیر دامنی) احکام کی تشخیص کے معیار، ان احکام کی تشخیص جو دین کی ذاتی حیثیت کا تقاضا ہیں، ان احکام

کے صحیح فہم، ادراک کے لئے ادبی اور اصولی قواعد اور سیاق و سباق سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور کی ضرورت، ہر زمانے میں عقل اور عدالت کے مطابق حکم اسلامی کو بیان کرنے پر گفتگو کی ضرورت اور فہم شریعت اور خود شریعت میں فرق جیسے مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان میں سے کسی بھی مسئلے پر صحیح رائے اس وقت تک قائم نہیں کی جاسکتی جب تک عقل کی حیثیت کا تعین نہ ہو جائے۔ ابن رشد کے نظریہ عقل و وحی میں مذکورہ مسائل کے سلسلے میں واضح موقف تک پہنچنے کے لئے کسی ٹھوس اور جدید راہ حل کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے اگرچہ انہوں نے اپنی کتاب ”بدایۃ المجتہد“ میں ”قیاس مرسل“ کی بھرپور تائید کر کے دین کے سلسلے میں اپنی فلسفیانہ سوچ کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ (۶۰)

۳۔ ابن رشد کے نظریہ عقل و وحی میں جدید لسانی فلسفہ اور علم التأویل (Hermeneutics) کی تحقیقات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو مد نظر نہیں رکھا گیا کہ جس میں الفاظ و معانی کے روایتی تصور کو یکسر باطل قرار دے دیا گیا ہے اور متن فہمی میں ذہنی مفروضات (Pre- assumptions) اور پہلے سے موجود تصورات (Pre- Conceptions) کو معانی تک پہنچنے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے الفاظ میں دین فہمی یا دینداری کے تین مرحلے ہیں:

(الف) خدا اور نبی کی شناخت۔

(ب) قرآنی آیات اور فرمودات رسول ﷺ کا فہم و ادراک۔

(ج) تعلیمات اسلام کے مطابق انسانی معاشرے کی رہنمائی۔

ابن رشد کے نظریہ عقل و وحی کا زیادہ تر تعلق پہلے مرحلے سے ہے۔ دوسرے مرحلے کے حوالے سے ابن رشد نے قرآن و سنت کے قطعی عقلی حکم کے متصادم نہ ہونے کی بات کی ہے لیکن لسانیاتی فلسفہ اور علم التأویل کے نتیجے میں فہم قرآن و سنت کے حوالے سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر بات نہیں کی۔ اسی طرح تیسرا مرحلہ تو بہت ہی اہمیت کا حامل ہے کہ جس میں انسانوں کی تعلیمات اسلام کے مطابق رہنمائی کرنے کے لئے سائنس اور مذہب کی حدود کا تعین بہت ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں فقہ کے قلمرو میں انسانی علم و عقل کا اثر و نفوذ کہاں تک ہے؟ اسی مشکل کے پیش نظر آج یہ

اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے عملی احکام (فقہ) بعض مقامات پر انفرادیت کھ بیٹھی ہے یا

ہیں۔ اسی طرح روایتی اور مروجہ اجتہادی اصولوں میں اجتہاد کی ضرورت کی بات بھی عقل کی حدود کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے کی جا رہی ہے۔

۵۔ ابن رشد کے فلسفہ دین میں صرف عقلی رخ کو اہمیت دی گئی ہے جبکہ دین کے اخلاقی اور متصوفانہ یا معنوی پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ ابن رشد کا تصور عقل و وحی میں ان کی اپنی نشاۃ کے برخلاف دین کے فلسفہ میں تبدیل ہونے اور وحی کے تقدس کے خاتمے اور فلسفیانہ فکر رکھنے والوں میں غلط تاویلات کی جرأت پیدا ہونے سے متعلق خدشات کو بہت تقویت ملتی ہے جبکہ ابن سینا نے جہاں خالص منطق اور فلسفہ پر زور دیا وہاں اپنی کتاب الاشارات والتنبیہات میں صوفیانہ مشاہدات اور مکاشفات پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ انہوں نے مذکورہ کتاب کے نمط نہم میں اہل عرفان کے مقامات اور نمط دہم میں آیات قرآنی کے اسرار پر نہایت عمیق گفتگو کرتے ہوئے جہاں یہ پیغام دیا ہے کہ عقلی مسائل پر غور و فکر کئے بغیر عرفان و تصوف پر سنجیدہ گفتگو نہیں کی جا سکتی وہاں یہ پیغام بھی دیا ہے کہ عرفان و تصوف کو فلسفہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

ان تمام چیزوں کے باوجود اگر ابن رشد کی دین فہمی کے سلسلے میں عقلی تحریک کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بعض کمزوریوں کے ہوتے ہوئے بھی سب سے اہم پیغام یہ ملتا ہے کہ عقل کے استعمال کو ہمیشہ اہمیت دی جانی چاہیے، عقل کو پختہ اور خالص بنانے کی طرف سفر جاری رہنا چاہئے، تمام تر ممکنہ انحرافات کے باوجود، عقل کا راستہ ہی اصل، بنیادی اور مطلوب ہے اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ابن رشد کے راستے میں جن کمزوریوں اور خدشات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا ازالہ بھی صرف انہی کی عقلی تحریک کو آگے بڑھانے کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں ابن رشد کے فلسفہ عقل و وحی کو دو اعتبار سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ عقل و دین کے بارے میں ان کے فلسفیانہ نقطہ نظر کا جائزہ لیا جائے دوسرے یہ کہ اس بات سے قطع نظر کہ ابن رشد نے اپنے نظریہ عقل و وحی کے ذریعے کس حد تک دینی مشکلات کے حل میں مدد دی ہے، ان کے عقلیاتی منہج (Methodology) کو اہمیت دی جائے۔ اس لحاظ سے عالم اسلام میں ابن رشد کی عقلی تحریک اپنی تمام تر خوبیوں اور کمزوریوں کے باوجود بجائے خود اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں دین میں غور و فکر اور تعقل و تدبر سے کام لینے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

## حواله جات

- ۱- مصطفیٰ ملکیان، تاریخ فلسفہ غرب، قم، پژوهشکده حوزه و دانشگاه، آبان ۱۳۷۹ ش، ص ۱۸۱
- ۲- ایضاً، ص ۱۸۱
- ۳- عقل و وحی در قرون وسطی، اتین جلیسن، ترجمہ شہرام پازوکی، تہران، مؤسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی، ۱۳۷۱، ص ۵۰۲
- ۴- روح فلسفہ در قرون وسطی، اتین جلیسن، ترجمہ ع۔ داؤدوی، تہران، انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۳۷۰، ص ۱۲
- ۵- ایضاً، ص ۱۳-۹
- ۶- بابک احمدی، مدرستیہ و اندیشہ انتقادی، تہران، نشر مرکز، ۱۳۷۳ ش، ص ۶۲، ۶۳
- ۷- ایان باربر، علم و دین، ترجمہ بہاؤ الدین خرمشانی، نشر دانشگاهی، ص ۷۱، ۸۰
- ۸- کانت، بخشش خرد ناب، ترجمہ میرشمس الدین سلطانی، تہران، انتشارات امیرکبیر، ص ۶۹۵
- ۹- میاں محمد شریف، تاریخ فلسفہ اسلام، تہران، مرکز نشر دانشگاهی، ج ۱، ص ۳۲۷
- ۱۰- ایضاً، ص ۷۳
- ۱۱- علی اصغر حطیبی، تاریخ فلسفہ در ایران و جهان اسلامی، تہران، کتاب فروشی زوآر، ۱۳۵۱ ش، ص ۵۴
- ۱۲- ایضاً، ص ۷۳
- ۱۳- ابو نصر فارابی، المسائل الفلسفیه و الاجوبۃ عنہا، بحوالہ تاریخ فلسفہ اسلامی در ایران و جهان اسلام، ص ۵۴
- ۱۴- ابن سینا، رسالۃ فی سرّ القدر، مجموعہ رسائل، تہران، انتشارات بیدار، ص ۱۳۳
- ۱۵- ابن سینا، الہیات شفا، فن سیزدہم، فصل معاد، بحوالہ ماجرای فکر فلسفی در جهان اسلام، ج ۲، ص ۱۳۳
- ۱۶- ابو حامد غزالی، تہانتہ الفلاسفہ، مصر، دارالمعارف، طبع سوم، ۱۹۵۸، ص ۱۹۵-۱۹۶
- ۱۷- دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، تہران، مرکز دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ج ۴، ۱۳۶۹ ش، ص ۱۲۶
- ۱۸- ڈی، اولیری، فلسفہ اسلام، مترجم: مولوی احسان احمد صاحب، حیدرآباد دکن، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، ۱۳۶۵ھ، ص ۲۰۵
- ۱۹- M.M Sharif, History of Muslim Philosophy, Royal Book Company, Karachi, 1983, P:544
- ۲۰- غلام حسین ابراہیمی دینانی، ماجرای فکر فلسفی در جهان اسلام، ج ۲، تہران، انتشارات وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی، ۱۳۷۷ ش، ص ۱۳۱
- ۲۱- صدر الدین شیرازی، شرح اصول کافی، ج ۱، ترجمہ محمد خواجوی، تہران، مؤسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی، ۱۳۶۰ ش، ص ۲۲۳، ۲۲۸
- ۲۲- ایضاً، مقدمہ، ص ۳۰
- ۲۳- ایضاً
- ۲۴- ایضاً
- ۲۵- ایضاً
- ۲۶- مہدی حائری یزدی، کاوشہای عقل نظری، تہران، دانشگاه تہران، ۱۳۳۸ھ ش، ص ۲۴۰
- ۲۷- ایضاً، ص ۲۴۱



- بہارہ ۱۳۸۰ء، ص ۵
- ۳۱۔ علاؤ الدین طوسی، تہافت الفلاسفہ، بیروت، دارالعالمیہ۔ ۱۹۸۱ء، ص ۵۹
- ۳۲۔ ابن میمون، دلالت الحائزین، حسین آتای، آنکارا، دانشگاه آنکارا، ۱۹۷۲ء، ص ۷۲، بحوالہ ماجرای فکر فلسفی در جہان اسلام، ج ۱، ص ۳۶۵
- ۳۳۔ فخر الدین رازی، البراہین در علم کلام، سید محمد باقر سبزواری، تہران، انتشارات دانشگاه تہران، ۱۳۳۱ ش، ص ۱۹۳-۱۹۹
- ۳۴۔ مصطفیٰ ملکیان، تاریخ فلسفہ غرب، قم، انتشارات پژوهشگاہ حوزہ و دانشگاه، آبان ۱۳۷۹ء، ص ۱۱۶
- ۳۵۔ عقل و اعتقاد دینی (مایکل پترسون، ویلیام ہاسکر، بروک ریشنباخ، دیوڈ ہازنجر)، ترجمہ احمد نزاقی و ابراہیم سلطانی، تہران، انتشارات طرح نو، ۱۳۷۶ ش، ص ۷۰-۸۵
- ۳۶۔ ابن رشد، منہاج الادلۃ فی عقائد الملۃ، قاہرہ، ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۳
- ۳۷۔ ابن رشد، تہافت التہافت، تحقیق مورلیس بویش، بیروت، ۱۹۳۰ء، ص ۵۸۲
- ۳۸۔ ابن رشد، تفسیر بزرگ بر کتاب فیزیک ارسطو، ترجمہ لاتیفی (مجموعہ آثار ارسطو)، 1,3، بحوالہ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، سوم، ص ۵۷۹
- ۳۹۔ ابن رشد، تہافت التہافت، ص ۲۵۵
- ۴۰۔ ایضاً، ص ۵۸۲
- ۴۱۔ ابن رشد، فصل المقال و تقریر ما بین الحکمۃ و الشریعۃ من الاتصال، ترجمہ اردو قاضی ابوالولید احمد بن رشد، کراچی، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲
- ۴۲۔ ایضاً، ص ۲۳-۲۵
- ۴۳۔ ایضاً، ص ۲۵
- ۴۴۔ ایضاً، ص ۲۶
- ۴۵۔ ابن رشد، مناج الادلۃ فی عقائد الملۃ، بحوالہ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ج ۳، ص ۵۸۱-۵۸۲
- ۴۶۔ ابن رشد، فصل المقال و تقریر ما بین الحکمۃ و الشریعۃ من الاتصال (ترجمہ اردو)، ص ۴۰
- ۴۷۔ ایضاً
- ۴۸۔ ایضاً
- ۴۹۔ آیت اللہ جوادی آملی، انتظار بشر از دین، قم، مرکز نشر اسراء، ۱۳۸۰ ش، ص ۸۳-۸۵
- ۵۰۔ علامہ محمد حسین طباطبائی، تالیقہ بر بحار، ج ۱، ص ۱۰۴، بحوالہ دفتر عقل از محسن کدیور، تہران، انتشارات اطلاعات، ۱۳۷۷ ش، ص ۱۱۷
- ۵۱۔ غلام حسین ابراہیمی دینانی، ماجرای فکر فلسفی در جہان اسلام، ج ۳، ص ۲۲۲
- ۵۲۔ مجتہد شبستری، تأملاتی در قرأت انسانی از دین، تہران، انتشارات وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی، ۱۳۸۳ ش، ص ۱۰-۱۸ (تلخیص)
- ۵۳۔ احمد نزاقی، رسالہ دین شناخت (مدلی در تحلیل ایمان ابراہیمی)، تہران، انتشارات وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی، ۱۳۷۸ ش، ص ۲۰
- ۵۴۔ ابن تیمیہ، الرد علی المطبقین، سلیمان الندوی، بمبئی، المطبعۃ القیمۃ، ۱۹۴۹ء، ص ۲۹۳
- ۵۵۔ ہر قفاس صورت اور مادہ پر مشتمل ہوتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والا نتیجہ بھی اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب

ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں یہ قیاس بھی پنہاں ہوتا ہے کہ جب کوئی شے کسی دوسری شے کے بعد وجود میں آتی ہے تو پھر اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ سائنسی علوم میں تمام قوانین مشاہدہ اور تجربے سے وجود میں آتے ہیں، اولیات (وہ قضایا جو واضح و بدیہی ہوں یعنی ان کا تصور ہی ان کی تصدیق کے لئے کافی ہوتا ہے جیسے کل کا جز سے بڑا ہونا)، متواترات (وہ قضایا جو افراد کی اتنی کثیر تعداد کی شہادت اور نقل سے حاصل ہوتے ہوں کہ جن کے صحیح ہونے پر یقین اور اطمینان و سکون حاصل ہو جاتا ہو)، حدسیات (وہ قضایا جن تک انسان حدس کے ذریعے پہنچتا ہو جیسے چاند میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کہ اس کی اپنی روشنی نہیں بلکہ سورج کی روشنی ہے) اور وہ قضایا جو حد اوسط پر بھی مشتمل ہو جیسے ۲، ۴ کا نصف ہے۔ ان قضایا کے قیاسات فطرت میں موجود ہوتے ہیں۔ (ڈاکٹر خوانساری، منطق صوری، تہران، مؤسسہ انتشارات آگاہ، ۱۳۸۱ ش، ص ۳۶۱-۳۶۹)

۵۶۔ ملاحم امین استرآبادی، الفوائد المدنیۃ، تہران، میرزا محسن کتاب فروش، ۱۳۲۱ ش، ص ۱۳۰

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۹

۵۸۔ غلامحسین ابراہیمی دینانی، ماجرای فکر فلسفی در جہان اسلام، ج ۱، ص ۳۳۲

۵۹۔ وجود کی حقیقت کے بارے میں فلاسفہ کے درمیان زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں چار نظریات پائے جاتے ہیں:

الف۔ کائنات میں صرف وحدت ہی وحدت ہے یعنی صرف ایک شخصی وجود ہے جو ذات باری تعالیٰ سے عبارت ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی چیز حقیقت میں موجود نہیں ہے بلکہ ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس قول کی رو سے کائنات میں موجود کثرت خیالی اور وہی ہے۔

ب۔ کائنات میں ”حقیقی وجود“ ایک ہی ہے جو واجب تعالیٰ کا وجود ہے لیکن دوسرے موجودات اسی حقیقی وجود سے منسوب ہونے کی وجہ سے کثرت کے حامل ہیں۔

ج۔ کائنات میں صرف کثرت ہی موجود ہے جبکہ وحدت ایک خیالی اور وہی چیز ہے۔ یہ قول بعض مشائخ فلاسفہ سے منسوب کیا گیا ہے۔

د۔ کثرت بھی حقیقت رکھتی ہے اور وحدت بھی لیکن یہ کثرت وحدت کے منافی نہیں ہے کیونکہ کثرت ایک لحاظ سے وحدت کی طرف ہی لوٹتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں کثرت اور وحدت میں اختلاف شدت و ضعف اور تقدم و تاخر وغیرہ کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً روشنی میں اختلاف شدت و ضعف کے اعتبار سے ہوتا ہے جو دراصل ایک ہی حقیقت کے درجات میں اختلاف کا نام ہے جبکہ روشنی ہونے کے لحاظ سے ہر درجہ مشترک ہے۔ اسی کو ملاصدرا نے تشکیکی اختلاف کا نام دیا ہے۔ (علی شیروانی، کلیات فلسفہ، قم، دارالتفہیم، ۱۳۷۸ ش، ص ۱۰۵-۱۱۲)

۶۰۔ ابن رشد نے قیاس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک قیاس خاص دوسرا قیاس عام کہ جسے ”قیاس مرسل“ کا نام دیا ہے۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ قیاس خاص کا تعلق محدود مسائل سے ہے کہ جہاں قیاس کرنے کے لئے شریعت کا حکم موجود ہوتا ہے لیکن قیاس عام (قیاس مرسل) میں پہلے سے شریعت کا کوئی حکم موجود نہیں ہوتا جس پر قیاس کیا جاسکے؛ و هذا النوع من القیاس هو الذی یسمى المرسل، وهو الذی لیس له أصل معین یستند الیہ (ابن رشد، بدایۃ المجتہد، ج ۲، ص ۸، بحوالہ فتحی حسن ملاکوی، عزیزی طہ السید، العطاء الفکرۃ لأبی الولید بن رشد، اردن، المعهد العالمی للفکر الاسلامی، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰)۔ ابن رشد کا کہنا ہے ”قیاس مرسل“ میں شریعت کے عام مقاصد کا سارا لہجہ ضرورت ہے۔